

اسے حمید

ناریں کا پھول



ناریں کا پھول

اے حمید

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

(1)

جب گلاب کی پٹنکھڑیوں میں چھپے ہوئے میٹھے شہد کی خوشبو جنگل میں اڑتی ہے اور آسم کے درختوں پر آیا ہوا بور اپنا شیریں رس زمین پر ٹپکانے لگتا ہے۔ تو بھنوروں کی ٹولیاں بے قرار ہو کر ان کی تلاش میں چل نکلتی ہیں۔ اس طرح ایک رات جنوبی سمندروں کی مرطوب ہوا ہمارے شہر میں سے گزری تو میں چھت پر لیٹے لیٹے۔ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس ہوا میں سمندر کے کنارے اُگے ہوئے ناریل کے درختوں کی خوشبو تھی یہ ہوا در اس کی طرف سے آرہی تھی۔ ساحل کارو منڈل سے بھی دور کولمبو سے آرہی تھی۔ جزیرہ لٹکا کے گھنے جنگلوں کی طرف سے آرہی تھی۔ میں نے سرہانے کے نیچے سے سگریٹ نکال کر سگایا اور اپنی چارپائی پر آلتی پالتی مار کر گوتم بدھ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور چپکے چپکے سگریٹ پیتا رہا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد مجھے گیان مل گیا۔ میں نے سگریٹ دوسرے مکان کی چھت پر پھینک دیا اور اندھیری رات کے آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر کہا۔

"کولمبو چلو۔"

جن دنوں میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھا کرتا تھا میں نے اردو کی کتاب میں لٹکا کی ایک تصویر دیکھی تھی۔ اس تصویر میں کیلے کے چوڑے چوڑے پتوں کے بیچ میں ایک جھونپڑی تھی جس کے باہر دو عورتیں زرد کیلوں کے گچھے اٹھانے کھڑی تھیں۔ ان عورتوں کا رنگ براؤن تھا۔ اور بدن کے گرد صرف ایک دھوئی لپیٹ رکھی تھی۔ ان کے چہرے بڑے اداس تھے۔ اس تصویر نے میرے دل و داغ پر گہرا اثر کیا تھا اور میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ بڑے ہو کر اس ملک کی سیر کو ضرور نکلوں گا۔ جہاں کیلے کے درختوں کے جھنڈ ہوتے ہیں اور براؤن رنگ کی نیم عریاں اداس عورتیں کیلوں کے زرد گچھے لیے

جھونپڑیوں کے باہر کھڑی ہوتی ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا کیلے کے درختوں کے پاس کھڑی سانولی عورتوں کے اداس چہرے دھندلے ہونے لگے۔ ایم۔ اے۔ اوکلج امرتسر کے گیٹ پر کھڑے ہو کر میں اپنے دوستوں کے ساتھ بھوسادل کے ہری پھیل کے کیلے کھاتا مگر مجھے لٹا دیں کی اداس عورتوں کا کبھی خیال نہ آتا۔

اس رات جب جنوبی ہند کے سمندر کی طرف سے مرطوب ہوا کے جھونکوں نے میرے شہر کی فضاؤں میں ناریل کے درختوں کی خوشبو اڑائی تو میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اسی وقت مجھے گیان ہوا کہ لٹا دیں کی سیر کرنی چاہیے۔ مجھے وہ ساری سانولی اور اداس عورتیں کیلے کے گنجان درخت اور ان درختوں کے بیچ میں بنی ہوئی بانس کی جھونپڑیاں یاد آ گئیں۔ ان دنوں میں کلج چھوڑ کر بیکار بیٹھا تھا اور والد صاحب مجھے پہلوانی کا فن سکھار رہے تھے۔ وہ مجھے امرتسر کا نامی گرامی پہلوان بنانا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں ایک بار لیکر سنگھ کے بیٹے سے کشتی لڑ کر اسے گرا دوں۔ لائن پار شیخ پٹی کے اکھاڑے میں وہ مجھے کثرت کرایا کرتے۔ منہ اندھیرے مجھے ساتھ لے کر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ میں جاگلیہ پن کر اکھاڑے میں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا۔ وہ میرے سارے بدن پر تیل کی مالش کرتے۔ پھر وہ مجھے اکھاڑے میں کھینچ لیتے اور بڑی بیدردی سے دھول دھوپ شروع کر دیتے۔ میری گردن میں ہاتھ ڈال کر زور زور سے جھٹکے دیتے۔ کبھی ٹانگ میں ٹانگ اڑ کر مجھے دھم سے گرا دیتے۔ کبھی کلا جنگ مار کر چاروں شانے چت گرا دیتے اور کبھی میری کمر پر سوار ہو کر ایک ٹانگ کو مروڑنا شروع کر دیتے۔ ساتھ ساتھ کھتے جاتے۔

"اسے بھی یاد رکھنا پترا۔ ہت تیرے شیر کی۔۔۔۔"

میری جان مصیبت میں آئی ہوئی۔ ڈنٹر پیل پیل کر پہلے ہی برا حال ہو گیا ہوتا۔ اب جو اوپر سے دھول دھپا ہوتا تو سارا بدن درد کرنے لگتا۔ اکھاڑے کی گیلی گیلی مٹی میں اوندھے منہ پڑا ہونکتا رہتا لیکن والد صاحب مجھے لیکر پہلوان کے بیٹے سے لڑوانا چاہتے تھے۔ وہ کمر میں دونوں ہاتھ ڈال کر مجھے زمین پر سے اٹھاتے اور دوسری طرف گرا دیتے میں دل ہی دل میں اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے پروگرام بنایا کرتا مگر والد صاحب بڑے جبر جنگ قسم کے آدمی تھے۔ ان کے چنگل سے بچ ٹکنا محال تھا۔ جس رات میں نے کولمبو جانے کا منصوبہ بنایا اس کے دوسرے روز اکھاڑے میں میں نے والد صاحب کے بدن پر

اکھاڑے کی مٹی ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"میں کولمبو جاؤں گا۔ اباجی۔"

والد صاحب نے سنی ان سنی کرتے ہوئے دو تین ایسی دھولیں ماریں کہ میرے ساتھ کولمبو بھی چکرا گیا۔ میں نے سوچا والد صاحب نے میری بات سنی نہیں۔ میں نے پھر کہا۔

"میں کولمبو جانا چاہتا ہوں۔"

والد صاحب نے اب کے ایسا دھوبی پٹا مارا کہ میں قلا بازی کھا کر پرے جا گرا۔ جب میں نے تیسری بار ان کے گوش گزار کیا تو انہوں نے اپنے کان میں سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا شے ہے؟"

میں نے کہا۔

"کولمبو بڑا خوبصورت شہر ہے اباجی۔ وہ لٹکا کا دارالحکومت ہے۔ وہاں کیلے کے درختوں کے بڑے بڑے جنگل ہیں اور ناریل کے جھنڈ۔۔۔۔"

"تیرے ناریل کی مال کی ایسی کی تیزی۔۔۔۔ لیکر سنگھ کے بیٹے سے دھگل کون کرے گا؟ ایں!"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے وہ دھول لگائی کہ کولمبو کا سارا جزیرہ ہل گیا۔

میں نے بڑے بھائی صاحب سے کہا۔

"بھائی جان میں کولمبو جانا چاہتا ہوں۔"

بکواس بند کرو۔

"بھائی جان میں وہاں ضرور جاؤں گا۔"

"وہاں کیا کرے گا۔؟"

"سیر کروں گا۔"

"ایک بار پھر بکواس بند کرو۔"

لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ لٹکا ضرور جاؤں گا۔ جس طرح گلاب کی خوشبو کے اڑتے ہی بمشورہ اپنے آپ کو اس کی طرف جانے سے نہیں روک سکتا۔ اسی طرح میں بھی جنوبی

سمندروں کی مرطوب ہواؤں کے سندیے کے بعد امرتسر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے رخت سفر باندھ لیا تھا۔ اپنی کشتی کا لنگر اٹھا لیا تھا اور بادبان کھول دیئے تھے۔ اب صرف موافق سمت کو چلنے والی ہوا کا انتظار کر رہا تھا۔ کہیں سے سمندر کی طرف چلنے والی ہوا کا جھوٹا آجائے۔ کہیں سے کچھ روپوں کا بندوبست ہو جائے۔ کسی طرح کو لمبو پہنچ جاؤں۔ وہاں جا کر مجھے پروا نہیں تھی۔ میں نوکری کر لوں گا۔ ایف اے پاس ہوں اور پھر ٹائپ بھی جانتا ہوں۔ کہیں نہ کہیں کام مل ہی جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اب روپے کہاں سے آئیں؟ میرے پاس صرف پچاس روپے جمع تھے۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک سو روپے کر کے دے دیئے۔ پچاس روپے میں نے اپنی بڑی ہمشیرہ سے لیے۔ مجھے خیال آیا پچاس روپے اپنے بڑے بھائی سے لئے جاسکتے ہیں۔

"بکواس بند کرو۔"

میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ سیرے پاس دو سو روپیہ موجود تھا۔ سو روپیہ والدہ سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے ہتھیا لیا۔ ایک صد روپیہ والد صاحب کی صدری کی جیب سے اڑایا اور گھر سے بھاگ کر کسی کو اطلاع دیئے بغیر اپنا سوٹ کیس اٹھا کر امرتسر کے سٹیشن پر آ گیا۔ فرنٹیر میل ان دنوں امرتسر سے رات کو چلا کرتی تھی۔ میں نے مدراس کا تیسرے درجے کا کھٹ کٹوایا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ میں چھپ کر بیٹھا رہا۔ اس خیال سے کہ کہیں والد صاحب کے پہلوان شاگردوں کا ٹولہ مجھے گرفتار نہ کر لے۔ گاڑی جب حریف پورے سے آگے نکل گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور سوٹ کیس سیٹ کے نیچے دھکیل کر کھڑکی کے پاس ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ سٹیشن پر گاڑی رکتی تو اندر جس کے مارے دم گھٹنے لگتا۔ جب چلتی تو ہوا لگتی۔ ایک موٹا لالہ اپنا سر سیرے کندھے پر رکھے سو رہا تھا۔ میں نے اپنا سر کھڑکی کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ جالندھر ٹکڑا تو مجھے نیند آنے لگی۔ کھڑکی کے ساتھ لگے لگے سو گیا جس طرح وہ ہندو لالہ میرے کندھے سے لگے لگے سو رہا تھا۔ اور بلاکت خیز خراٹے لے رہا تھا۔

گاڑی میرٹھ کے سٹیشن پر پہنچی تو دن نکل آیا تھا۔ لالہ نے رام رام کرتے اپنا سر سیرے کندھے پر سے اٹھایا اور منہ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

کیوں جی کون سا شہر ہے یہ؟

"میرٹھ۔"

"ابھی دلی دور ہے۔"

اتنا کچھ کہ اس نے پھر اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ میں نے بڑے اطمینان سے اس کا نام لیا ایسا منہ ہوا سر پکڑ کر دوسرے آدمی کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس آدمی نے چونک کر اپنے کندھے پر دو سر دیکھے تو بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنا سر جھٹک کر لالے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دلی پہنچ کر مجھے گاڑی بدلنی تھی اور مدراس جانے والی ٹرین میں سوار ہونا تھا۔ دلی سٹیشن پر بڑی چل پھل تھی۔ بمبئی جانے والی ساریوں کا ہجوم لوٹے، پاندان اور اگالہ ان اٹھائے فرنٹیر میل کی طرف بڑھا۔ میں نے سوٹ کیس قلی کے سر پر رکھا اور خود بمبئی کی ساریوں کی ٹانگوں میں سے ہو کر باہر پلیٹ فارم پر نکل آیا۔ ایک عورت نے اپنا گرا رکھنے والی کر چیخ ماری۔

"اوئی یہ کون ہے مو؟"

میں نے نیچے ہی نیچے سے جواب دیا۔

"میں ہوں بوا۔"

پلیٹ فارم پر آ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور قلی سے پوچھا کہ مدراس جانے والی گاڑی کون سے پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ اس قلی نے بڑی کھنداری زبان میں بتایا کہ گاڑی نمبر 5 پر کھڑی ہے اور ایک گھنٹہ بعد چھوٹے گی۔ وہاں جا کر دیکھا کہ گاڑی میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ ہر ڈبہ منہ در منہ بھرا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے سیکنڈ کلاس کے ساتھ لگے ایک نوکروں کے ڈبے میں میں نے سوٹ کیس رکھوایا قلی کو پیسے دیئے اور خود ایک جگہ جا کر چائے وغیرہ پی۔ منہ ہاتھ دھویا۔ ڈبے والوں سے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ کسی کا نوکر نہیں ہوں۔ انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے غسل خانے کے دروازے کے ساتھ کھڑے ہونے کو جگہ دے دی۔ ایک آدمی نے پوچھا۔

"مہماں جاؤ گے میاں؟"

"مدراس۔"

وہ آدمی ذرا چوٹا۔

"ارے میاں اتنی دور کیا کھڑے ہی کھڑے جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"بزرگوں سے سن رکھا ہے جب گاڑی چلتی ہے تو جگہ اپنے آپ بن جایا کرتی ہے۔" وہ آدمی ہنس دیا۔

"ارے میاں گھبراؤ نہیں ہم تمہیں تصویبی بہت جگہ بنا دیں گے۔ لیکن میاں تم ذرا "ڈیل ڈول" کے اچھے ہو۔ کسی کو اوپر نہیں چڑھنے دینا اب یہ تمہاری ڈیوٹی لگا دی ہے ہم نے سمجھے میاں۔

"سمجھ گیا میاں جی۔"

اس کے بعد میں تن کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ چار آدمیوں نے پاگلوں کی طرح اندر گھسنے کی کوشش کی جن میں سے ایک کو میں نے گردن پر گھونسا مارا۔ دوسرے کے ہاتھ پر مکا مارا۔ تیسرے نے میری ناک پر مکا مارا۔ اور چوتھا ڈر کے مارے دوسرے ڈبے کی طرف بھاگ گیا۔

اس لڑائی نے ڈبے والے نوکروں اور صاحب لوگوں کے بیروں پر میری دھاک بٹھا دی اور انہوں نے بڑی خوشی سے مجھے کھڑکی کے پاس ایک صندوق پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ کیونکہ مدراس کے راستے میں ان گنت سٹیشن پڑتے تھے اور ہر سٹیشن پر مسافروں کے جہوم نے اس ڈبے پر دھاوا بولنا تھا۔

خدا خدا کر کے گاڑی روانہ ہوئی۔ تھی تو یہ گاڑی مدراس ایکسپریس۔ مگر اس شریف زادی نے شاید ہی کوئی سٹیشن راستے میں چھوڑا ہو۔ اگر غلطی سے کوئی سٹیشن راستے میں ٹکل جاتا تو واپس پلٹ کر وہاں آن کھڑی ہوتی اور پھر بڑی تیزی سے دوسرے سٹیشن پر کھڑی ہونے کے لئے وہاں سے بھاگنا شروع کر دیتی۔ دو دن اور دو رات کے سفر نے میری کمر توڑ دی۔ میرے ڈبے والے نوکر اور بیروں کو قریباً ہر سٹیشن پر بھاگ کر اپنے اپنے صاحب لوگوں کی خدمات کو دوڑنا پڑتا۔ ان کے بھی چلیے بگڑ گئے۔ مدراس پہنچ کر انہیں دیکھا تو جو مسافر کہ سٹیشن پر جوان تھا وہ بورٹھا نظر آتا تھا۔ جو بورٹھا تھا وہ قریب الرگ معلوم ہو رہا تھا۔ دلی سے چلے تو ناگ پور نے آنے کا نام نہ لیا۔ ہر کوئی یہی کہتا کہ بس اب ناگ پور آ رہا تھا۔ ناگ پور کے سنگترے بڑے مشہور تھے۔ اچھا سٹیشن آئے پوری درجن سنگتروں کی کھائیں گے لیکن ناگپور مدراس ایکسپریس کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اپنے

سارے سنگترے کے باغوں کو لے کر وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ چلا جا رہا تھا۔ آخر کسی نہ کسی طرح ناگپور آ ہی گیا۔ بہت بڑا سٹیشن تھا۔ گاڑی ایک پل پر سے گزری۔ نیچے چوک میں سباش چندر بوس کا ایک مجسمہ نصب تھا۔ لوگ سائیکلوں، بیل گاڑیوں اور موٹر گاڑیوں میں آ جا رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر سنگترے بک رہے تھے۔ ان کی رنگت سبز تھی لیکن بڑے بیٹھے تھے۔ یہاں کھانا کھایا، سنگترے کھائے، پانی پیا اور اس اسید میں ریل میں سوار ہو گئے کہ بیسوارہ بھی آئے گا۔

بیسوارہ اس سے آگے بہت بڑا جنکشن تھا مگر اُس نے بھی ناگ پور والا ہاتھ دکھایا۔ پوری رات گزر گئی لیکن بیسوارہ صاحب نہ آئے۔ اگلے روز دوپہر کے بعد جب کمر ہمت ٹوٹ گئی تو بیسوارہ کا اسٹیشن آیا۔ یہاں گاڑی کو ایک گھنٹہ کھڑے ہونا تھا۔ یہاں سے پہاڑی راستہ شروع ہوتا تھا۔ بیسوارہ کا شہر پہاڑ کی ڈھلان پر پھیلا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ میری شیو بڑھ آئی تھی۔ پلیٹ فارم پر گھوم پھر کر حجام کی تلاش کی مگر بے سود آخر ایک جگہ چپ چاپ ناچار ہو کر بیٹھ گیا۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ پلیٹ فارم کے جھگے کی دوسری طرف ایک دھوئی پوش بھنگ آدمی کھڑا ہے اور دور سے مجھے استرا دکھلا کر اپنے پاس بلارہا ہے۔ میں ڈر گیا۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ذرا آؤ میں بڑی محبت سے تمہارا گلا کاٹوں گا۔ لیکن جب یقین ہو گیا کہ وہ حجام ہے تو میں جھگے کے پاس گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ واقعی حجام ہے اور اندر اس لئے نہیں آ رہا تھا کہ حجاموں کو پلیٹ فارم پر آنے کی اجازت نہیں۔ میں جھگے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوسری طرف کھڑے کھڑے میرے گالوں پر صابن ملنا شروع کر دیا۔ پھر استرا چلانے لگا۔ استرا وہ میرے گالوں پر چلا رہا تھا اور چوری آنکھ سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی ریلوے کا ملازم تو اُسے قانون کی خلاف ورزی کرتے نہیں دیکھ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو تین جگہوں پر سے جلد کٹ گئی اور خون بہنے لگا۔

"کیا کرتے ہو کھینے!"

"ٹھیک ہو گا بابو۔ ٹھیک کر دے گا۔ معافی دے گا۔"

اس کے ساتھ ہی اُس نے پھٹکڑی نکال کر گالوں پر پھیرنا شروع کر دی۔ پھٹکڑی زخم پر تیزاب کی طرح لگی۔ میری چیخیں ٹکل گئیں۔ لیکن حجام نے پوری طرح مجھے قابو میں کیا ہوا

تھا۔ وہ ٹھڈی پر استرا چلا رہا تھا کہ اچانک مجھے وہیں چھوڑ کر لائنوں کی طرف جاگ گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک ریلوے افسر نے اُسے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا یہ ریلوے افسر لاہور کے ریلوے سٹیشن کے قلی سے ملتا جلتا تھا مجھے دیکھ کر بولا۔

"ادھر داڑھی واڑھی نہیں ہو گا بابو ادھر زری مانہ ہو گا زری مانہ"

میں نے ٹھڈی پر پچے ہوئے سنت بالوں پر انگلیاں پھیر کر کہا۔

"تم کہاں سے آگے کھوتے دے پتر۔"

"کیا بولا بابو۔"

بولو تم "خانہ برانداز کے پتر ہو۔"

وہ ہنس پڑا۔ کالا کالا جبرٹا کھل گیا اور دانت باہر نکل آئے۔ میرا ناکام بگورٹا حجام دور لائنوں میں کھڑا استرا دکھا کر مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ ادھر گاڑی نے سیٹی دے دی۔ میں نے دونی اس کی طرف پھینک دی اور اپنی گاڑی کی طرف اٹھ دوڑا۔ ڈبے میں پہنچ کر جب میرے ساتھیوں نے میرے چہرے کی حالت دیکھی تو سب ہنسنے لگے۔ میں نے پوری کھانی سنائی تو وہ زیادہ ہنسے۔ ایک بیرے نے اپنے ٹرنک میں سے سیفٹی ریزر نکال کر دیا۔ جس کی مدد سے میں نے اپنی داڑھی کے باقی بالوں کو صاف کیا۔ بیہواڑہ سے نکل کر مدراس ایکسپریس کی رفتار غیر متوقع طور پر تیز ہو گئی اور اس نے شاید تھے میں آ کر دھڑا دھڑ چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑنا شروع کر دیئے۔ میرے ایک ساتھی نے کہا۔

"ڈرائیور نے شراب پی لی ہے ورنہ یہ گاڑی ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتی۔"

اب مدراس کی آمد آمد تھی۔ اونپے اونپے ٹیلے کھیتوں جنگلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

دریائے زبرد گذر گیا تھا۔ تپستی گذر گیا تھا۔ گوداوری گذر گیا تھا اور اب دریائے کرشنا گذر رہا تھا۔ ایک پل زیر تعمیر تھا۔ یہاں پر سے گذرتے ہوئے گاڑی کی رفتار کم ہو گئی۔ نہچے مزدور عورتیں اور مرد کام کر رہے تھے۔ کوئی زمین کھود رہا تھا۔ کوئی گارا اٹھا رہا تھا۔ کوئی پتھر ڈمورہا تھا۔ مرد صرف لنگوٹ پہنے ہوئے تھے۔ کالے اور پتے دہلے کمزور بیمار۔۔۔ فاقہ زدہ۔۔۔

عورتوں نے صرف ایک ہی جیتھرا جسم پر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ بھی بیمار اور کمزور تھیں۔ بدن ننگے ہو رہے تھے۔ مگر جانوروں کی طرح کام کر رہی تھیں۔ اگر کام نہ کریں تو کھانیں کہاں سے؟ مدقوق بچے ایک طرف سائے میں لیٹے رو رہے تھے۔ ان لوگوں نے گاڑی گزرتی دیکھی

تو کام چھوڑ دیا اور ہاتھ پھیلا کر مانگنے لگے۔ لوگوں نے ٹرین کی کھڑکیوں میں سے ڈبل روٹی کے ٹکڑے، بیٹریاں اور پیسے نہچے پھینکے جن پر یہ مزدور عورتیں اور مرد کتوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ اس افزائری میں کتنی مزدور عورتوں کی چھاتیوں پر سے چیتھڑے پھسل گئے اور وہ ننگی ہو گئیں۔ جس پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے شوقین مزاج خیر حضرات نے خوب خوب آوازے کے میرے پاس بیٹھے ہوئے راولپنڈی کے بیرے نے زور سے چٹخارا لیا اور ہاتھ باہر نکال کر بولا۔

"چلو سونبیوں سیل کر آئی لیا ہے۔"

دائیں بائیں پام، ناریل اور کیلے کے درختوں میں گھرے ہوئے بنگلوں، پختہ عمارتوں اور کارخانوں کی لمبی لمبی چمنیوں نے پہلے ہی بتا دیا کہ مدراس آ رہا ہے۔ یہاں آسمان پر کالی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گاڑی ایک بہت بڑی ریل کی پٹریوں کے میدان میں سے گذر کر مدراس سٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ سبز سبز پگڑیوں، سفید کوٹوں اور سفید دھوتیوں والے ٹکٹ چیکر پلیٹ فارم پر ادھر ادھر کھڑے تھے۔ میرے ڈبے کے نوکروں اور بیروں نے منہ ہاتھ دھو کر چھوٹے چھوٹے آئینے سامنے رکھ کر خوب بال وغیرہ چمکا لیے تھے اور صاف ستھرے کپڑے پہن لیے تھے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو قلیوں کے ایک ہجوم نے اُس پر حملہ کر دیا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس ایک قلی کے سر پر رکھا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ہمارے ٹکٹ راستے میں ہی ریلوے کے ملازموں نے چیک کر لیے تھے۔ چنانچہ یہاں ٹیکسیاں اور گھوڑے گاڑیاں اور بیل گاڑیاں پلیٹ فارم کے ساتھ ہی سرک پر کھڑی تھیں۔ ہوٹل کے لمبٹ آگے بڑھ بڑھ کر اپنے اپنے ہوٹلوں کے کارڈ دکھلا رہے تھے اور بڑی چرب زبانی سے مسافروں کو پھانسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ہر لمبٹ کے ہاتھ سے کارڈ لے کر اُسے دیکھا، پڑھا اور پھر واپس کر دیا اور گھوڑا گاڑی میں سوٹ کیس رکھوا لیا۔

"کہاں کو بابو؟"

"سراٹے میں۔"

گاڑی مدراس کے بازاروں میں سے گزرنے لگی اور نیچی اونچی پختہ عمارتیں، چوڑی چوڑی سڑکیں، سڑکوں پر بجائے ہوئے رکنا، موٹر گاڑیاں، سائیکل سوار اور بیل گاڑیاں اور

دوسرے روز مولوی کبیر یا مجھے اپنے ساتھ فورٹ والے علاقہ میں لے گیا۔ ہم مدراس کے ایگورسٹیشن سے بجلی کی لوکل ٹرین میں ایک آنے کا ٹکٹ لے کر سوار ہوئے اور

ہر حرکت کو دیکھتا رہا۔ اب اس نے سرخ مرجوں کی چٹنی لاکر رکھ دی۔ میں بیٹھے بیٹھے کانپ گیا۔ چاروناچار کھانا شروع کر دیا۔ دال میں پہلے ہی سے مرجوں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ ذرا سی چٹنی ساتھ لے کر کھائی تو اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ ناک آنکھ سے پانی بہنا شروع ہو گیا۔ روتے ہوئے اٹھا اور بل ادا کر کے روتا ہوا باہر سرک پر آ گیا۔

اگلے روز مولوی کبیریا نے ساتھ لے جا کر اپنے خونخوار دانتوں والے ڈاکٹر سے پھر میرے بازو میں ٹیکہ لگوا یا۔ اس کے تین دن بعد وہیں سے مجھے پرمٹ مل گئی۔ مولوی کبیریا نے پرمٹ میری جیب میں ڈالتے ہوئے کہا:

"تم سے کیا پردہ میاں۔۔۔۔۔ مسلمان آدمی ہوں۔ داڑھی کی ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ڈاکٹر نے پورے بیس روپے مانگے ہیں۔"

میں جکرا گیا۔ قریب تھا کہ مولوی کبیریا پر گر پڑوں کہ اس نے مجھے کمر سے پکڑ لیا۔

"حوصلہ کرو میاں۔۔۔۔۔ پچاس روپے کا کام تھا جو بیس روپے میں ہو گیا۔۔۔۔۔ مسلمان آدمی ہوں۔ داڑھی رکھ کر جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

میں نے بادل ناخواستہ دل میں مولوی کبیریا کو ایک ہزار ایک گالیاں دے کر بیس روپے اس کے حوالے کر دیئے۔ سرائے میں آیا تو ایک مسافر نے جو کولمبو سے واپس آیا تھا۔ بتایا کہ مولوی کبیریا بڑا سکار اور دھوکے باز آدمی ہے۔ اس نے ڈاکٹر کو صرف پانچ روپے دیئے ہوں گے اور باقی پندرہ روپے اپنے جیب میں رکھ لئے ہوں گے۔ کیونکہ اس کا تو دھنڈا ہی یہی ہے۔

"اگر تم یہاں سے سیدھے سرکاری دفتر میں چلے جاتے تو دو روپے میں تمہیں ٹیکہ بھی لگ جاتا اور پرمٹ بھی مل جاتی۔"

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ مولوی کبیریا کی چڑیاں میرا کھیت چگ گئی تھیں۔ میں صرف اتنا ہی کر سکا کہ مولوی کبیریا کے دیئے ہوئے بستر کی ایک سفید چادر سوٹ کیس میں چھپا کر ساتھ لے آیا۔ اس چوری نے مجھے بڑا ذہنی سکون دیا۔

میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن گیا ایک تو مدراس میں ٹیکسی سستی سواری تھی اور دوسرے اس سے پہلے کہ مولوی کبیریا کو پاد کی گمشدگی کا علم ہو۔ میں اسٹیشن کے بجوم میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔ مدراس کے دوسرے بڑے اسٹیشن کلیان پردھن کوٹھی جانے والی گاڑی

تیار کھڑی تھی۔ دھنن کوٹھی ہندوستان کی ٹکون کا آسری سٹیشن تھا۔ یہاں سے مجھے براہ راست کولمبو کا ٹکٹ مل گیا۔ گاڑی میں یہاں بھی کافی رش تھا۔ جانے ہمارے ملک کی گاڑیوں میں اتنا رش کیوں ہوتا ہے۔ ہر ٹرین کو دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ شہر کی آبادی شہر چھوڑ کر باہر بھاگی جا رہی ہے۔ اور شہر میں آؤ تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے شہروں کے لوگ بھی یہاں آکر بے ہیں۔

بہر حال مجھے تھوڑا کلاس کے جس ڈبے میں جگہ ملی وہاں دوسرے لوگوں کے علاوہ تین سرمنڈھی گیروے کپڑوں والی بدھی بکشین بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان تین عورتوں میں سے ایک سگار پی رہی تھی اور باقی دو پان چہا رہی تھیں۔ تینوں کی چند یا چمک رہی تھیں اور آنکھیں سرخ لگا رہی تھیں۔ مزدور قسم کے مدراسی پھنگی اور قریبی جنسوں نے تیل بھرے کالے سیاہ ٹھنکھریا لے بالوں کو کھینچ کر پیچھے چٹیا سی بنا رکھی تھی۔ پسینوں کی بو اڑانے کچر کچر باتیں کر رہے تھے اور جگہ جگہ پان کی تنوک پیونک رہے تھے۔ ڈبے میں برسات کی وجہ سے بڑا حبس تھا اور گرمی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔

ٹھیک وقت پر گاڑی نے وٹل دیا اور گاڑی کی سیٹی پر پلیٹ فارم پر سے آگے کی طرف کھینکنے لگی۔ جب ٹرین سٹیشن سے باہر نکل آئی تو میری جان میں جان آئی کیونکہ مجھے ابھی تک مولوی کبیریا کا دھمکا لگا ہوا تھا۔ کیا خبر وہ پولیس لے کر وہاں آجائے اور میرے سوٹ کیس میں سے اپنی چادر برآمد کر لے۔ انتہائی طور پر میں نے اس کی چوری تو کر لی تھی، لیکن اب اپنی عزت کا خیال آ رہا تھا۔ بہر حال بلا سر سے ٹل گئی اور گاڑی فراٹے بھرتی مدراس شہر کی مصافاتی عمارتوں، بنگلوں، کوٹھیوں، اور پھل دار باغات کو پیچھے چھوڑتی دھنن کوٹھی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

شہر پر شہر آنے اور گزرتے چلے گئے۔ کچھ مسافر اترے کچھ مزید ڈبے میں آکر بیٹھے۔ مگر ان سب کی وضع قطع لباس اور بول چال ایک جیسی تھی۔ پتھروں کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ پان پر پان کھاتے تھے اور بیڑیوں پر بیڑیاں پیتے تھے۔ سبوں کے رنگ کالے تھے اور آنکھیں سپیروں کی مانند سرخ تھیں۔ تبورو آیا جہاں کے بدھی سندر مشہور ہیں۔ مدورا آیا۔ جہاں کی عورتوں کی آنکھیں شربت جیسی ہوتی ہیں اور بال ایڑی تک پہنچتے ہیں۔ اس اسٹیشن پر مدراسی لوگ ہر ڈبے کی کھڑکی میں منہ ڈال کر مدراسی اور انگریزی زبان میں کھتے کہ رایشورم کے

مشہور تاریخی مندروں کی زیارت کرنے والے یہاں اتر پڑیں۔

ترچناپلی کے سٹیشن پر گاڑی آدھ گھنٹہ رُک رہی۔ یہ شہر جو مندروں اور درگاہوں کے لئے مشہور ہے۔ اس راستے کا سب سے بڑا شہر تھا۔ بہت خوبصورت سٹیشن تھا۔ جس کے پلیٹ فارم ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے اوپر سے گزر گئے تھے۔ یہاں مدراس ایسی خوبصورت ٹیکے نہیں نقش والی سانولی لڑکیاں دیکھنے میں آئیں جن کے جوڑوں میں سفید پھول لگے تھے اور ناک اور کان کے زیوروں میں سبز ہتھ چمک رہے تھے۔ میں ڈبے سے باہر نکل آیا تھا اور سنگھٹ سگائے پلیٹ فارم پر ٹھل رہا تھا۔ ایک لڑکی نے سامنے والے پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے ایک پل کے لئے گھور کر دیکھا۔ اس نے کالے ہاڈوالی سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جسم بڑا نازک تھا اور رنگ سانوالا تھا۔ جوڑے میں موتے کے کھلے ہوئے پھول لگے تھے اور ناک کے کیل میں سرخ رنگ جھللا رہا تھا۔ پاؤں میں چمڑے کی سیاہ چپل تھی۔ اس نے یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ یا پہچان لیا ہو اور اب وہ حیرت سے پوچھ رہی ہو کہ تم یہاں کیسے نکل آئے میں بھی اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے آنکھیں دوسری طرف کر لیں اور پُل پر سے گزرنے لگی پُل کے آخری کنارے پر جا کر اس نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا اور میری نگاہوں سے غائب ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مسکرا دی ہو۔ اس کے بعد میں اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھ سکا اور شاید زندگی میں پھر کبھی اسے نہیں دیکھ سکوں گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس لڑکی کا دلکش چہرہ اور میری طرف گھورتی ہوئی بڑھی سیہ آنکھیں میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ اگر میں بوڑھا ہو کر مرا تو بستر مرگ پر اس لڑکی کو یاد کر کے میری آنکھوں سے ضرور آنسو نکل آئیں گے اور مجھے یوں غموس ہو گا جیسے میں نے کل ہی اس لڑکی کو ترچناپلی کے سٹیشن پر دیکھا ہو۔ ایسی کتنی ہی دلکش چہروں اور جادوگر آنکھوں والی لڑکیاں ہیں جو اس وقت اس ملک کے ہر بڑے شہر، شہر کے ہر گلی کو سچے کے مکان میں بیٹھی گھر کا کام کاج کر رہی ہیں۔ بھائیوں کو سلا رہی ہیں۔ اسکول کی طرف جا رہی ہیں۔ اپنے محبت کرنے والوں کے انتظار میں بس سٹاپ پر بے چینی سے کھڑی ہیں۔ لیکن ہم انہیں نہیں جانتے وہ ہمیں نہیں جانتیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا۔ ہم ایک دوسرے کو اس زندگی میں کبھی نہیں دیکھیں گے اور اسی دوری اور جدائی میں مرجائیں گے اور کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوگی۔ یہ کتنی ناگزیر اور کتنی افسانہ ناک حقیقت ہے۔ کیا ایسا

نہیں ہو سکتا کہ دنیا کا ہر آدمی دنیا کے ہر آدمی کو ملے بغیر کبھی اس دنیا سے رخصت نہ ہو؟ ترچناپلی سٹیشن پر سے ایک نوجوان میرے ڈبے میں آ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ ہم نے بہت جلد ایک دوسرے سے باتیں شروع کر دیں۔ گاڑی اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔ اس لڑکے کا نام کرشن تھا اور وہ ترچناپلی میں تیزاب کے کارخانے میں ملازم تھا اور اپنی بیمار ماں کی مزاج پر سی کے لئے کار تیکا جا رہا تھا۔ کار تیکا ترچناپلی سے سات گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ہمارے ڈبے میں ایک تنک دھاری سادھو بھی آکن بیٹھا تھا۔ کرشن نے مجھے بتایا کہ یہ سادھو 'مہر بنم' ہے۔ کندر گام میں شویٹے کندا سوامی کا بہت بڑا مندر ہے۔ کندا سوامی کے بھگتوں کو تامل میں 'مہر بنم' کہتے ہیں۔

میں نے کہا۔

"خدا کرے کہ تیری ماں اچھی ہو جائے۔"

در اصل مجھے اپنی ماں یاد آ گئی تھی۔ جو بے چاری امرتسر میں بیٹھی مجھے یاد کر رہی ہو گی۔ میں نے تو اسے بھی خبر نہیں کی تھی کہ میں جا رہا ہوں۔ میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ کو لمبو پہنچ کر سب سے پہلے میں والدہ کو اپنی خیریت کا خط لکھوں گا۔ کرشن کی مسکراہٹ بڑی دل میں اثر کرنے والی تھی۔ اس نے افسردگی سے مسکرا کر کہا:

"بگوان میری ماما جی کی رکھنا کریں گے۔ ماما جی کو مجھ سے بڑا پیار ہے۔ میں بھی ان سے بڑا پیار کرتا ہوں۔ میں ہفتے میں ایک بار ضرور گھر جا کر ماما جی سے مل آتا ہوں۔ نوکری جو ہوئی کیا کروں۔ مجبوری ہے جو ان بہن کی شادی کرنی ہے۔ پتا جی بوڑھے ہو گئے ہیں اور بیمار رہتے ہیں۔ چھوٹا بھائی اسکول میں پڑھتا ہے۔"

کار تیکا کا سٹیشن کہیں رات کو آیا۔ کرشن نے میرا کندھا ہلا کر مجھے جگا دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا:

"نہتے دوست! میں جا رہا ہوں۔"

میں نے نیند بھری آنکھیں کھول دیں اور ہاتھ جوڑ دیئے۔

"نہتے کرشن! بگوان تیری ماما جی کو اچھا کریں۔"

کرشن نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر نہتے کیا اور نیچے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ اس کے بعد میں نے اس بھولے بھالے لڑکے کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ جواں کی محبت میں سرشار تھا اور

جس کا دنیا میں سوائے ماں کے اور کوئی نہیں تھا۔
دوسرے روز گاڑی منڈاپم کیپ پہنچ کر رک گئی۔ معلوم ہوا کہ کولمبو جانے والے
مسافروں کو یہاں ٹیکے لگانے جائیں گے۔ تو کیا مدراس والے خونخوار ڈاکٹروں کے ٹیکے فراڈ
تھے؟ میرے ایک ساتھی مسافر نے کہا:

”ادھر کا ٹیکہ ایک دم کندم۔ ایدھر جو ٹیکہ لگتا ہے وہ سرکاری ہوتا ہے۔ اس کا پرچی
ملتا ہے باپو۔“

منڈاپم کیپ بڑی ہی بد وضع خشک اور بور جگہ تھی۔ اب اس گاڑی میں زیادہ تر کولمبو
جانے والے مسافر ہی سوار تھے۔ منڈاپم کا سٹیشن معمولی سا تھا۔ ادھر ادھر آبادی کا کہیں بھی
نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دور دور کچھ جمونہڑیوں کی قطاریں نظر آرہی تھیں۔ چاروں
طرف ریستے میدان تھے۔ جس کے ٹیلوں پر کہیں کہیں ناریل اور تار کے جھکے ہوئے درخت
کھڑے سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے سمندر
قریب ہی ہے۔ گویا ہم لوگ ہندوستان کی جنوبی نکلون کے آخری سرے پر پہنچ گئے تھے۔
گاڑی اور محکمہ کے لوگ ہم مسافروں کو ہٹا کر بکریوں کی طرح ایک ٹین کی اونچی چھت والے
برآمدے میں لے گئے۔ یہاں کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں مل رہا تھا۔ کونے میں صرف ایک
تل لگایا تھا، جس میں سے گرم پانی باہر نکل رہا تھا۔ دھوپ بڑی تیز تھی اور گرم ہوا چل رہی
تھی۔ برآمدے کی ٹین کی چھت تپ رہی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ کسپر سی کے عالم میں یہاں
بیٹھے رہنے کے بعد ایک کالا بھنگ مکروہ صورت مدراسی ڈاکٹر آیا اور اس نے کرسی پر بیٹھ کر
باری باری مسافروں کو ٹیکہ لگانا شروع کر دیا۔ وہ بڑی بے نیازی اور بے دردی سے سرخ کی
سوئی بازو میں گھونپ دیتا اور پھر ایک پرچی پر مسافر کا نام لکھ کر اپنے دستخط کرتا اور پرچی تھما
دیتا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد یہاں سے چھٹارہ نصیب ہوا۔ اس دوران مولوی کبیریا کی چرائی
ہوئی چادر فرش پر بچھا کر اس پر آلتی پالتی مارے بیٹھا سگرٹ پھونکتا رہا اور مولوی کبیریا کے
ڈاکٹر کو کوستا رہا۔

خدا خدا کر کے لوگ ٹرین میں سوار ہونے اور گاڑی منڈاپم کیپ سے آگے کو روانہ
ہوئی۔ اب زیادہ تر میدان ریستے تھے۔ کھیتوں اور سرسبز جھگڑ کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن
ناریل اور تار کے درخت کہیں کہیں ضرور دکھائی دے جاتے تھے۔ گاؤں گزرتے جو چند ایک

جمونہڑیوں پر مشتمل ہوتے۔ ان جمونہڑیوں کے باہر ننگ و درنگ کالے کالے غربت کے
مارے لڑکے جھاگ کر گاڑی کی طرف آتے اور پھر مدت کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر ریل کا تماشا
کرنے لگتے۔

کوئی دو گھنٹے بعد بائیں طرف کو سمندر دکھائی دینے لگا۔ سمندر کا رنگ گہرا سبز تھا اور
گاڑے موبل آئل کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ سمندر آہستہ آہستہ قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔
سمندر میں سے ایک بڑی سی جمیل نکل کر میدان میں آگئی تھی۔ اس پر ریلوے والوں نے
پتھر ڈال کر پل بنا دیا تھا۔ یہ پل کوئی ایک میل لمبا تھا۔ جب گاڑی اس پر سے گزری تو وہ
منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ کیونکہ ایک طرح سے گاڑی سمندر پر سے گزری رہی تھی۔ پانی کا
وہی گہرا سبز رنگ تھا اور اس کی بڑی بڑی لہریں سمندر کے پتھروں سے ٹکرا کر جھاگ

اڑا رہی تھیں۔ سب مسافر کھڑکیوں پر جھک کر اس نظارے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ پل
پر سے گزر کر گاڑی پھر ریستے میدان میں دوڑنے لگی۔ گاڑی کی رخسار ہلکی ہو گئی تھی۔ کیونکہ
ایک تو لائن ریت پر بھی ہوئی تھی۔ دوسرے یہاں موڑ بہت آ رہے تھے۔ اب خلیج بنگال
اور بحیرہ عرب کے سمندروں کا پانی صاف نظر آ رہا تھا۔ بائیں طرف کو وسیع و عریض سمندر
پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان کی نکلون کا آخری سٹیشن دھنس کوڈی آ گیا تھا۔ گاڑی ایک معمولی
سے بغیر پلیٹ فارم کے سٹیشن پر کھڑی ہو گئی۔ میں نہ دیکھا کہ پاس ہی سمندر میں ایک چھوٹا
جہاز کھڑا ہے۔ ہمیں اب ریل میں سے اتر کر اس جہاز میں سوار ہونا تھا۔ اس جہاز نے خلیج
بنگال اور بحیرہ عرب کے طے ہوئے سمندر کو عبور کر کے لٹاکا کے جزیرے میں داخل ہونا تھا۔
جہاز پر سوار ہونے سے پہلے ہمیں لائن کے پار قطار بنا کر کھڑا کر دیا گیا اور کسٹم والوں نے
ہمارے سامان کی تلاشی لی۔ پرمٹ اور ڈاکٹری سرٹیفکیٹ چیک کیے۔ ان رسومات سے فارغ
ہو کر ہمیں جہاز پر سوار ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ مزدور مسافروں کا سامان اٹھا کر خیموں
کی طرح جہاز کی طرف اٹھ دوڑے۔ ہر طرف ایک بگدریسی مچ گئی تھی۔ میں نے بھی اپنا سوٹ
کیس ایک قلی کے سر پر رکھوایا اور گونگ دے پر سے گزر کر جہاز کے عرشے پر آ گیا۔ اس
جہاز کی تھوڑا کلاس عرشے کے نیچے پہلی منزل میں تھی۔ یہاں اس قدر گرمی، جس اور اندھیرا
تھا کہ دم ٹلا جا رہا تھا۔ میں نے سوٹ کیس ایک مارواڑی سیٹھ کے حوالے کیا اور خود ڈیک پر

شام ہو گئی تھی جب کو لمبو ایکسپریس تالی مینار سے چلی۔

"پائین اہل سر!"

میں نے ایک "قتلہ" خرید لیا۔

"ایک سینٹ سمر!"

تالی بیٹار میں ہمیں کرنسی بدل دی گئی تھی۔ ایک سینٹ اکنی کے برابر تھا۔ لٹاکا میں اکنیوں کی جگہ سینٹ چلتے تھے۔ روپیہ روپے کا ویسے ہی تھا اور نوٹ بھی ہندوستان کے نوٹوں ایسے ہی تھے۔ میں نے ایک سینٹ ادا کر دیا اور لٹاکا کی اس خوبصورت بیٹی کو دیکھتا رہ گیا۔ اس نے سفید دھوتی کس کر باندھ رکھی تھی۔ جس میں سے اس کے کولہوں کے خم باہر جھانک رہے تھے۔ اوپر والے حصے پر صرف ایک انگلیا ہی تھی۔ پیٹ بڑا صاف اور ملائم تھا۔ سیاہ بالوں کا جوڑا بنا ہوا تھا۔ جس میں کنول کا پھول کان کے اوپر دائیں جانب نیچے کو لٹک رہا تھا۔

"پائین ایپل سر؟"

آگیا جو دراصل صرف سیکنڈ کلاس کے مسافروں کے لئے وقف تھا۔ ٹکٹ چیکروں کی نظر سے بچنے کے لئے جہاز کے لانچ میں آکر بیٹھ گیا اور چائے پینے لگا۔ اس چھوٹے سے جہاز کا نام پہل تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد اس نے گھگھو دیا اور اس کا لنگر اٹھادیا گیا اور جہاز سمندر میں جیٹی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھلے سمندر میں تھا اور جزیرہ لنکا کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ جس وقت ہندوستان کا ساحل نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا ادھر سے لنکا کے ساحل کے درختوں کی چوٹیاں نظر آنا شروع ہو گئیں۔ دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ کی شدت کم ہو گئی تھی۔ اور آسمان پر سیاہ بدلیوں کے قافلے چل نکلے تھے۔ ٹھیک پہلے گھنٹے کے بعد پہل نامی جہاز کا لنگر سمندر میں ڈال دیا گیا۔ ملاحوں نے موٹے موٹے رے اچھال کر جیٹی پر پیمینک دینے۔ کسٹم والوں نے جہاز میں آکر مسافروں کے سارے سامان کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ تب کہیں جا کر سیرزمی لگی اور ہم لوگ قلیوں کے ہجوم کو چیرتے نیچے اتر آئے لنکا کی سرزمین میں اتر کر میں نے گھراسانس لیا اور موس کیا کہ فضاء میں اُسی سمندری ہوا کی مرطوب بورجی ہوئی ہے جو مجھے بلانے اس رات یہاں سے چل کر امرتسر آئی تھی۔ سامنے ہرے بھرے جنگل کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جس میں نارمل اور تارڑ کے درختوں کے جھنڈ ٹھٹھالے جزیرے کی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر ان درختوں کو سلام کیا اور سوٹ کیس قلی کے سر پر رکھوا کر اس چھوٹی لائن کی سبز گاڑی کی طرف چل پڑا جو کولمبو جانے کے لئے ذرا سے فاصلے پر تیار کھڑی تھی۔

لڑکی دوسرے ڈبے کی جانب بھاگ گئی اور میں انسان کی خوشبو لیتا اس کا میٹھا رس
 حلق میں اندھلٹا ویسے ہی کھڑا رہا۔ انہن نے سیٹی دی میں اچک کر ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اور
 گاڑی روانہ ہو گئی۔ ہر سٹیشن کے پلیٹ فارم پر سرخ بری بھی تھی اور لوہے کے جھگے کے
 اوپر سرخ پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کی قطاریں جھکی ہوئی تھیں۔ گاڑی ایک بار پھر
 پہاڑیوں کا پکر کاٹتی پانس کے گھنے جنگلوں اور دھان کے کھیتوں کے طویل سلسلوں میں سے
 گذر رہی تھی۔ اتنے گنجان جنگل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ تاریک جنگلوں کے
 بیچوں بیچ گہری سبز پر سکون جھیلوں پر کنول کے سپید اور کاسنی پھول کھل رہے تھے۔
 کھیتوں میں سیلونی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ دھان کی بوائی کر رہی تھیں۔ کھیں کیلے کے
 درختوں میں زرد کیلے کے گچھے کے گچھے لٹک رہے تھے۔ کھیں پانوں کے کھیت چلے گئے
 تھے۔ کھیں پہاڑوں کی ڈھلانوں پر عورتیں جمے لے پیچھے لٹکے چائے کی پتیاں چن رہی
 تھیں۔ دو ایک دریا بھی گذرے۔ ان کا نام مجھے یاد نہیں۔ ان کے دیر بنے ہوئے پل کاریگری
 کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ دن کے کوئی گیارہ بجے کے قریب گاڑی کولمبو پہنچ گئی۔

کولمبو میں کولمبو نام کا کوئی ریلوے سٹیشن نہیں۔ کولمبو کے دو بڑے سٹیشن ہیں۔
 ایک کا نام مروانہ اور دوسرے سٹیشن کا نام فورٹ ہے۔ ہماری گاڑی مروانہ سٹیشن پر آ کر
 رکی۔ سنہالی لوگ مدراسیوں کی طرح کے جھوٹے قد، سیاہ رنگت، دبیلے پتلے، اور کمزور صورت
 ----- سفید دھوتیاں، سفید پتلونیں، سیاہ چلیں، چھتیاں اور بیشتر پاؤں سے ننگے
 ----- ریلوے کے ملازموں کا بھی یہی لباس تھا۔ سفید کوٹ، سفید دھوتی اور سیاہ چپل
 ----- سٹیشن بڑا خوبصورت اور جدید وضع کا تھا۔ پلیٹ فارم کشادہ اور چھت اونچی تھی۔
 اسے دیکھ کر بمبئی کا سنٹرل سٹیشن یاد آ گیا۔ سنہالی عورتیں جو اپنے اپنے رشتہ داروں کو لینے
 آئی تھیں، اپنی قسم کی الگ خوبصورتی کی مالک تھیں۔ ان کے رنگ کھلتے ہوئے تھے۔
 چہرے گول گول تھے۔ بری عورتوں کی طرح رنگدار دھوتیوں کے اوپر ریشمی صدیاں پہن
 رکھی تھیں اور سیاہ جھکیلے بالوں میں سفید یا سرخ پھول لگے ہوئے تھے۔ بعض عورتوں نے
 بھر پور رنگوں والی ساڑھیاں زیب تن کر رکھی تھیں۔ ان کے مقابلے میں مرد کمزور اور غیر پر
 کش شخصیت کے نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر اپنا سوٹ کیس باہر نکالا اور ایک
 شخص کو سوٹ کیس اٹھانے کو کہا۔ اُس شخص نے قبر بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر

کہا:

"مسٹر میں قلی نہیں ہوں، میں ٹکٹ چیکر ہوں، اپنا ٹکٹ دکھاؤ۔"

میں تو حیران رہ گیا۔ جلدی سے ٹکٹ نکال کر اسے دکھایا۔ اس نے ٹکٹ پر پرنس
 سے نشان لگایا اور مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ یہاں قلیوں اور ٹکٹ چیکروں میں بہت کم فرق تھا۔
 ----- قلیوں کی کوئی خاص وردی نہ تھی۔ اب میں کسی قلی کو
 پکارتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ کیا خبر وہ سٹیشن ماسٹر نکل آئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک قلی خود آ
 گیا اور میرا سوٹ کیس اٹھا کر باہر لے آیا۔ باہر آ کر میں نے دیکھا کہ بہت بڑا چوک ہے،
 جہاں بجلی کی بسیں، ٹرائیں، اور موٹریں آگے پیچھے بھاگی جا رہی ہیں۔ بارش ہوئے ہٹی تھی کہ
 لٹکا دیش کے باشندے چھتیاں کندھوں پر لٹکائے تیز تیز قدموں سے فٹ پاتھ پر چلے جا
 رہے تھے۔ ایک ٹیکسی والا میرے پاس آ کر انگریزی میں بولا:

"ہوٹل چلے گا بابو؟"

یہاں انگریزی اور ہندوستانی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ میں نے سوچا یہاں کوئی واقعہ کار
 نہیں ہے۔ پہلے ہوٹل میں ہی چلنا چاہیے۔ وہاں جا کر کوئی پکا بندوبست کیا جائے گا۔ چنانچہ میں
 ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور سے مل کر اس بات کا پوری طرح اطمینان کر لیا تھا کہ
 ہوٹل درمیانے درجے کا ہو اور اس کے اخراجات زیادہ نہ ہوں۔ ٹیکسی مجھے کولمبو شہر کی
 خوبصورت سڑکوں کی سیر کرواتا ہوئی ایک ہوٹل میں لے آئی۔ یہ ہوٹل معمولی سی عمارت
 میں واقع تھا۔ کئی روز کے سفر کا تھکا ہارا تھا۔ کمرے میں آتے ہے کھانا کھا کر سو گیا اور شام
 تک سوتا رہا۔ شام کو اٹھ کر نہایا کپڑے تبدیل کئے اور شہر کی سیر کو نکل گیا۔ کولمبو کی حسین
 سڑکوں پر روشنی ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی عمارتوں میں بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ کچھ دور تک میں
 یوننی آوارہ گردی کرتا پھرا۔ میرے راستے میں دو سینما گھر بھی آئے۔ یہاں ایک جگہ سنہالی
 فلم اور دوسری جگہ انگریزی فلم چل رہی تھی۔ چونکہ مجھے سڑکوں سے ابھی پوری طرح واقفیت
 نہیں تھی۔ اس لئے جلدی ہی واپس ہوٹل آ گیا اور کمرے میں آ کر کھانا کھانے کے بعد سو
 گیا۔

اگلے روز صبح اٹھا اور ناشتہ کرنے کے بعد لوگوں سے پوچھتا پوچھ کے علاقے میں آ گیا۔
 یہ کولمبو کا کاروباری علاقہ تھا اور لاہور کی اکبری منڈی کی طرح گنجان اور گندہ تھا۔ دراصل یہ

کولمبو کا پرانا شہر تھا۔ اس جگہ میں نے راوٹ کے زمانے کے بت اور کھنڈرات دیکھے۔ یہاں بوسیدہ اور تنگ و تاریک عمارتیں تھیں جن کے ایک ایک فلیٹ میں چار چار کنبے آباد تھے۔ یہ کاروباری علاقہ تھا اور شہر کے سارے غلے اور اجناس کا کاروبار یہاں ہوتا تھا۔ یہاں سبزی منڈی تھی۔ گھاس منڈی تھی۔ سیوہ منڈی تھی۔ غلہ منڈی تھی، صرف ہیرا منڈی نہیں تھی۔ جس کا مجھے بے حد افسوس ہوا۔ ان ساری منڈیوں پر ہندوستانیوں اور بیشتر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ ان میں مدراسی، بنگالی اور سیلون کی مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہاں میں جہاں حاجی نامی غلے کے ایک اچھے خاصے تاجر سے ملا۔ دارمی مونچہ صفا چٹ گورے رنگ کا یہ جوان آدمی پشاور کا رہنے والا تھا اور کوئی پندرہ برس سے کولمبو میں تجارت کر رہا تھا۔ غلے کے ساتھ ہی ساتھ وہ پھلوں کی آڑھت کا کام بھی کرتا تھا۔

جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے کولمبو کی سیاحت کا شوق یہاں کھینچ لایا ہے اور میں نوکری کرنا چاہتا ہوں، تاکہ سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ پیسٹ بھی پال سکوں تو اس نے مسکرا کر کہا:

"کوئی بات نہیں تم ہمارے بھائی ہو، ہم سے جو ہو سکے گا تمہارے لئے کریں گے۔" اس نے مجھے اپنی دکان پر ڈھڑھ سو روپے ماہوار پر نوکر رکھ لیا۔ ساتھ دکان کے اوپر پندرہ روپے ماہوار پر ایک کمرہ بھی لے کر دے دیا۔ میں نے ہوٹل سے اپنا اکلوتا سوٹ کیس اٹھایا اور وہاں آکر رہنے لگا۔ میرا کام سٹور میں جمع شدہ مال کی چیکنگ اور بیوپاریوں کو مال حوالے کرتے وقت ان کا حساب کتاب رکھنا تھا۔ دوکان میں حاجی جہاں کا ہسنوٹی بھی تجارت میں برابر کا شریک تھا اور حاجی کے ساتھ ہی بڑی سی میز پر بیٹھا تھا۔ یہ شخص کرنجی آنکھوں اور سنہری مونچھوں والا بھاری بھر کم آدمی تھا جو سنہری فریم کی عینک لگاتا۔ حاجی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ کبھی کبھی شر بھی بھرتا ہے۔ اس کا نام انجم تھا۔ انجم بڑا باغ و بہار آدمی تھا اور مکان میں بیوپاریوں سے بڑی اونچی آواز میں باتیں کرتا اور بات بات پر قہقہے لگایا کرتا۔ کاروبار میں بڑا سیانا اور زیرک تھا۔ بیوپاریوں کو شعر سناسنا کر خوش کیا کرتا اور کیا مجال جو ایک دھیلے کا مال زیادہ دیدے۔ حاجی صاحب کا منشی ایک بورٹھا مدراسی مسلمان تھا۔ جس کی دارمی سفید تھی اور عینک کی ایک کمانی ٹوٹ گئی تھی۔ جہاں اس نے دھاگہ باندھ کر کان کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ یہ شخص انتہائی کم گو تھا۔ صرف دیکھتا تھا اور منہ سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔

ایک ماہ تک کام کرنے کے بعد میں نے پہلی تنخواہ لی تو اس میں سے کرایہ اور ہوٹل کے کھانے کا بل کاٹ کر بچا سو روپے والدہ کو ابر کسر منی آرڈر کر دیئے اور ساتھ ہی قسلی کا خط بھی لکھ دیا۔

والدہ نے جو خط لکھا اس میں مجھے دعائیں دیں اور کہا کہ میں اداس ہوں پردیس میں نوکری کر کے تم جائیداد نہیں بنا لو گے۔ گھر آ جاؤ گھر کی روکھی سوکھی بُری نہیں۔ کم از کم میری آنکھوں کے سامنے تو ہو گے۔ میں نے لکھا کہ میں ابھی لٹکا کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی ابر کسر نہیں آؤں گا۔ ہماری مائیں تو سبھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان کا بس چلے تو عمر بھر ہمیں اپنے سے جدا نہ ہونے دیں۔ بے چاری مائیں۔ پیٹے تو ان کی جنت ہوتے ہیں۔ لیکن اس جنت کا انجام ہمیشہ افسوسناک ہوتا ہے۔ کسی پیٹے کو پردیس چھین کر لے جاتا ہے اور کسی کو ہواڑا کر لے جاتی ہے۔ ماں کا تو صرف اتنا کام ہوتا ہے کہ لڑکی کو جوان کر کے داماد کے حوالے کر دے اور پیٹے کو پال پوس کر بہو کے حوالے کر دے اور خود چار پانی پر پڑ کر کھائیں اکھائیں کر موت کا انتظار کرتی رہے۔

میں صبح آٹھ بجے دکان پر آ جاتا۔ دوپہر تک کام کرتا۔ دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھاتا۔ پھر نوکری پر حاضر ہو جاتا اور شام پانچ بجے تک کام کرتا رہتا۔ اس کے بعد شہر کی سیر کرنے نکل جاتا۔ میں نے بس میں اور ٹرام میں سوار ہو کر شہر کا کافی حصہ دیکھ لیا تھا۔ شہر کا دوسرا حصہ بڑا خوبصورت اور دلکش تھا۔ شاندار بیگے، بلند پختہ عمارتیں سینما گھر، چوڑی چوکی سرٹکین دلکش کشادہ بیچ، سمندر کا کنارہ، ناریلوں کا جھنڈ، گال روڈ جو بڑی کشادہ اور بے حد طویل تھی۔ اور سمندر کے ساتھ ساتھ کئی میل تک چلی گئی تھی۔ حاجی صاحب کی کوٹھی شہر سے باہر ایک بڑی ہی پُرفضا جگہ پر واقع تھی۔ لائن میں ناریل اور سرخ پھولوں والے درخت تھے۔ میں کبھی کبھی ان کی کوٹھی پر بھی جایا کرتا۔ حاجی صاحب کی بیوی بڑی ہنس مکھ اور اچھے سبھاؤ کی پشیمان عورت تھی۔ اس عورت کی چھوٹی بہن گل زیب بڑی خوبصورت اور دہلی پتلی گوری چٹنی لڑکی تھی۔ میں جو فطرتاً عاشق مزاج ہوں اور ہر لڑکی پر فوراً عاشق ہو جاتا ہوں۔ گل زیب پر بھی عاشق ہو گیا۔ میں نے اس سلسلے میں اُس لڑکی سے مشورہ کرنے کی تکلیف بھی گوارہ نہ کی اور بڑی گرمجوشی سے اس کے ساتھ عشق کرنے لگا۔ جب کبھی کوٹھی میں جاتا تو ٹھنکی باندھ کر گل زیب کو دیکھتا اور جب وہ ٹھنکی نظر میں جھکا لیتی تو بڑا خوش

ہوتا۔ کیونکہ میری منطق میں یہ محبت کا جواب تھا۔ لیکن اس کا کیا علاج وہ حاجی جبار خان کی سالی تھی اور خدا جبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ شاید حاجی صاحب بھی اسے پسند نہ کرتے۔ بعد میں پتہ چلا کہ لڑکی کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی۔ ایک روز میں نے تنہائی میں موقع پا کر گل زنب سے عشق کا اظہار کر دیا۔ اُس لڑکی نے میری باتیں خاموشی سے سنیں اور پھر آنکھیں اٹھا کر بولی۔

"وصال صاحب! میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا ذکر بنائی جان سے نہیں کروں گی۔ آپ براہ مہربانی آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کریں۔"

مجھے گل زنب کی اس بات نے کوئی صدمہ نہ دیا۔ نہ ہی مجھے حیرت ہوئی۔ کیونکہ نفسیاتی طور پر ہر لڑکی سے عشق کرنے والا نوجوان ایک آدھ لڑکی کو یونہی چھوڑ سکتا ہے۔ میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"گل زنب اگرچہ میرا نام وصال احمد ہے لیکن مجھے محبت میں وصال کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ محبت میں میں ہجربیک ہوں۔ پھر بھی گل زنب تمہیں ایسی بے رخی زنب نہیں دیتی۔"

گل زنب کمرے سے باہر نکل گئی۔

اب مناسب یہی تھا کہ حاجی جبار کی نوکری چھوڑ دی جائے اور کسی دوسری جگہ قسمت آزمائی کی جائے۔ ویسے بھی نوکری کے لیے کو لمبو نہیں آیا تھا۔ نوکری چاہیے جہاں بھی مل جائے۔ مقصد تو یہ تھا کہ سیر و سیاحت کا خرچ چلتا رہے۔ دوسرے مجھے یہ ملازمت پسند بھی نہیں تھی۔ غلے کی منڈی میں رہ کر میں بھی غلہ بن گیا تھا۔ کسی وقت موس ہوتا کہ میں چنے کی دال ہوں۔ مونگ پھلی ہوں۔ ہینگ ہوں۔ خربوزے کو دیکھ کر میرا خربوزہ بھی رنگ پکڑنے لگتا تھا۔ میں نے شہر میں کچھ لوگوں سے واقفیت پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ کسی دوسری جگہ نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ انجمن صاحب کا شاعر ہونا میرے کام آ ہی گیا۔

جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن جنوب مشرقی ایشیاء میں اتحادی فوجیں مقبوضہ علاقوں میں ابھی تک مقیم تھیں۔ ان کی تفریح طبع کے لئے ریڈیو سی سی ایک سیلون سے ہندوستانی میں ہر روز صبح اور شام کو تین گھنٹے پروگرام ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی مشاعرہ بھی ہو جایا کرتا۔ ایک مشاعرے میں انجمن صاحب گئے تو مجھے بھی ساتھ لیتے گئے۔ وہاں میری ملاقات اس ہندوستانی

پروگرام کے انچارج میجر حامد سے ہو گئی۔ میجر حامد امرتسر کے رہنے والے تھے اور کشمیری تھے۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے اور پوچھا۔

"کونسا محلہ ہے آپ کا؟"

میں نے اپنے محلے کا نام لیا اور کہنے لگے۔

"بھئی ہم تو کٹڑہ کرم سنگھ میں رہتے ہیں۔"

اس کے بعد میں جب کبھی اُن سے ملا انہوں نے بڑی محبت کا اظہار کیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں کچھ لکھا بھی لیتا ہوں تو مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ میں فوجیوں کے لئے بھی کوئی تفریحی پروگرام لکھ دیا کروں۔ ایک دو بار میں نے مزاحیہ فیچر بھی لکھے جو انہوں نے بہت پسند کئے۔ اب جو ادمر نوکری والا معاملہ گڑبڑ ہوا تو میں نے سوچا کیوں نہ میجر حامد سے مل کر بات کی جائے۔

چنانچہ میں نے فوراً انہیں فون کیا اور شام کا وقت لے لیا۔ شام کو میں ان کے دفتر ریڈیو سی سی ایک سیلون پہنچ گیا۔ یہ ریڈیو سٹیشن میونسپل ہال کی شاندار عمارت کے سامنے ایک خوبصورت کونٹری میں واقع تھا۔ جس کے گیٹ پر ایک سنگین بردار فوجی پہرا دے رہا تھا۔ میں نے اُسے میجر حامد کا حوالہ دیا تو اُس نے گیٹ پوسٹ کے انچارج سے کہلوایا کہ میجر حامد فون کروایا۔ میجر حامد نے فون پر کہا کہ آنے دو اور میں گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ میجر حامد اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا اپنی سیکرٹری کو کچھ لکھوا رہا تھا۔ مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ سیکرٹری میرے سامنے بیٹھی تھی۔ ہمرے ہمرے جسم والی انگریز عورت تھی۔ اچھی خاصی شکل و صورت کی تھی۔ میں عاشق ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کافی آنکھ سے اُسے برابر دیکھتا رہا۔ سانس لینے سے اس کے سینے کا ابھار آہستہ آہستہ اوپر نہچے ہو رہا تھا۔ ہال سنہری تھے اور ناک کی چونچ سرخ ہو رہی تھی۔ کاسنی رنگ کے ہلکے گاؤں میں تھی بازو ننگے تھے اور جس ہاتھ کو وہ میز پر رکھا کر لکھ رہی تھی۔ اُس کی بغل میں سے سنہری بالوں کی ایک جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

جب سیکرٹری جلی گئی تو میجر حامد نے مجھے سگریٹ پیش کیا اور میرے آنے کا مقصد پوچھا۔

میں نے صاف صاف بات بیان کر دی کہ نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ آٹے ڈال کا حساب

کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔ یہاں رہ کر فوجیوں کے لئے کچھ لکھنا لکھانا چاہتا ہوں۔ میرا حامد مسکرایا اور بولا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ تم تو اچھا خاصا لکھ لیتے ہو اور ہمارے پاس لکھنے والوں کی پہلے ہی سے کمی ہے لیکن جیسا کہ تمہیں معلوم ہے یہ ایک فوجی ریڈیو سٹیشن ہے۔ یہاں میرا سارا سٹاف موجود ہے۔ مجھے تمہارے لئے خاص طور پر ہیڈ کوارٹر کو دہلی لکھنا ہو گا اور منظوری منگوانی ہو گی۔ تم کچھ دیر انتظار کرو میں آج ہی ہیڈ کوارٹر خط لکھے دیتا ہوں۔"

میرا حامد نے وعدہ کے مطابق اسی روز خط لکھ دیا۔ ایک ہفتے بعد اُس نے مجھے فون پر بلایا اور کہا کہ میں اُسے مل لوں۔ ملنے پر معلوم ہوا کہ ہیڈ کوارٹر نے مجھے ملازم رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ایک تو آٹے دال سے نجات ملی تھی۔ دوسرے نوکری بڑی آسان تھی۔ تیسرے تنخواہ ساڑھے چار سو روپے ماہوار تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دفتر شہر کے خوبصورت علاقے میں تھا۔ میں نے فوراً حاجی جبار خاں کے ہاں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ میں نے حاجی صاحب کو بتا دیا کہ مجھے ریڈیو سیلون میں نوکری مل گئی ہے۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے اجازت دے دی۔

میں نے ریڈیو سیلون پر کام شروع کر دیا۔ دن کو دس بجے پہلے ٹرانسمیشن کے لئے آتا اور ایک بجے واپس چلا جاتا۔ شام کو چار بجے آتا اور چھ بجے کام ختم ہو جاتا۔ میرا کام ہر روز فوجیوں کی تفریح طبع کے لئے کوئی مزاحیہ خاکہ، کہانی، فیچر یا گیت مالا لکھنا تھا۔ شروع شروع میں کچھ دقت ہوتی لیکن کچھ دنوں بعد کام چل نکلا۔ ابھی میری رہائش حاجی صاحب کی دکان کے اوپر تھی۔ کچھ دنوں بعد میرا حامد نے اپنے اثرو رسوخ سے مجھے ایک جگہ کوٹھی میں پچاس روپے ماہوار پر ایک کمرہ لے دیا۔ یہ کوٹھی بوریا جنکشن میں واقع تھی۔ اس کا نام اولس پیلس تھا اور یہ ایک ہالینڈ کی ادھیڑ عمر کی عورت مسز جونز کی ملکیت تھی۔ اس عورت کا خاوند سیلون ٹی کمپنی میں نائب مینجر تھا اور بڑا بھولا بھالا ہنس کھ اور سیدھا سادا انگریز تھا۔ گھر میں وہ نیکر پہن کر گھومتا رہتا اور لان میں بیٹھ کر سیلون کی دیسی شراب پر ابرق کے جام پر جام لٹھکایا کرتا۔ مسز جونز بھی پینے میں اُس سے پیچھے نہیں تھی۔ لیکن بڑی کنجوس عورت تھی۔ ننگے پاؤں صرف ایک چولا غالباً گاؤں پہن کر بیٹھے کے کمروں اور برآمدوں میں چکر لگایا کرتی اور اپنے لڑکوں ایلیں اور ڈیوڈ کو پکارتی رہتی۔

یہ دونوں لڑکے ایک ہی آفت کی پڑیا تھے۔ ان کا کام سکول سے واپس آ کر غلیل ہاتھ میں لے کر سارا دن سامنے والی کوٹھیوں کے عقبی ذخیرے میں بلبوں کا شکار کرنا، بندر کی طرح تاڑکے درخت پر چڑھ کر نادل ٹوڑ توڑ کر نہچے گانا اور دوسروں کی کوٹھیوں میں اُگے ہوئے پیپتے کے درختوں پر سے پیپتے چرانا تھا۔ مسز جونز سگریٹ گھٹیا بییتی۔ شراب اس کا ایک رشتے دار جو کانا تھا اور جس کا سخت چہرہ بھری ڈاکوؤں سے ملتا جلتا تھا۔ ہر روز شام کو لے آتا تھا۔ شراب پی کر مسز جونز بڑی مخیر اور دریا دل عورت بن جاتی۔ اس کا دل گداز ہو جاتا وہ بات بات پر آنسو بہانے لگتی اور اپنی جیب سے سگریٹ نکال نکال کر دوسروں کو پیش کرتی۔ اُس وقت اس کا منہ پسینے میں تر بتر ہوتا۔ ہانسیں گال کا سناکاسنی رنگت اختیار کر کے کانپ رہا ہوتا۔ چوڑے ہونٹ پھر کک رہے ہوتے اور غمور آنکھوں میں محبت اور مامتا کے جذبات شامیں مار رہے ہوتے۔ وہ اپنے دونوں لڑکوں کو پاس بلا کر انہیں بڑا پیار کرتی اور جیب سے ساری نقدی نکال کر ان میں تقسیم کر دیتی۔ یہ الگ بات تھی کہ صبح کو جب اُسے ہوش آتا تو دونوں لڑکوں کو اپنے سامنے کھڑے کر دیا کہ ان سے ایک ایک پانی رکھوا لیتی۔ مسز جونز کی والدہ ہالینڈ سے ہجرت کر کے کولمبو آئی تھی۔ مسز جونز کولمبو میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ انگریزی اور سنہالی بڑی روانی سے بول لیتی تھی۔ مسز جونز کی والدہ نے بوریا جنکشن میں بہت سی زمین خرید کر چھ سات کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ مسز جونز اپنی ماں کی اکھوتی بیٹی تھی۔ ماں کی وفات کے بعد ساری جائیداد اُس کے پاس آ گئی۔ اب وہ بوریا جنکشن کی سات کوٹھیوں کی واحد مالک تھی۔ سامنے والی کوٹھی میں اس کے رشہ دار رہتے تھے اور باقی کوٹھیاں کرائے پر دے رکھی ہیں۔ مسز جونز مالدار عورت تھی۔ لیکن اس کا لباس ہمیشہ بد وضع اور بے ہنگم ہوتا۔ میں نے اُسے ایک گاؤں کے علاوہ اور کسی لباس میں نہیں دیکھا۔ اس نے تین چار گاؤں بنا رکھے تھے۔ جنہیں وہ بدل بدل کر سارا سال پہنا کرتی۔ کوٹھی میں وہ ہمیشہ پاؤں سے تنگی رہتی صرف بازار جاتے ہوئے ایک چپل پہن لیتی۔ اس کا جسم بھاری تھا۔ عمر چالیس سال کے قریب تھی، رنگ زردی مائل سا نولا تھا اور بالوں کا گردن پر جوڑا سا بنا کر رکھتی تھی۔ اس کے برعکس مسٹر جونز چوڑا چکلا اونچا لمبا گورا چٹا آدمی تھا۔ عمر چالیس سے اوپر تھی لیکن چہرے پر بٹاشٹ اور رونق رہا کرتی۔ شراب پی کر جب وہ بھرپور قہقہے لگاتا تو معلوم ہوتا کوئی خوش فکر جہازی کپتان ادھر نکل آیا ہے۔

کانا عاشق اپنی محبوبہ کا ہاتھ تمام کر دے پاؤں گوریلا ایسی احتیاط کے ساتھ اندر داخل ہوتا اور میز کے گرد بیٹھ کر کافی آنکھ کو بار بار جھپکاتا۔ دوسری آنکھ سے ادھر ادھر دیکھتا شروع کر دیتا۔ شراب وہ جو ہے کی طرح بغیر آواز اور کسی قسم کی آہٹ کے پی جاتا۔ اُسے بالکل نشہ نہیں ہوتا تھا۔ یعنی یوں کہہ لیجئے کہ وہ کبھی مشرجونس کی طرح پی کر شور نہیں مچاتا تھا اور نہ ہی مسز جونس کی طرح شراب کے فتنے میں بچوں میں پیسے تقسیم کرتا تھا۔ اور نہ بات بات پر رونا شروع کر دیتا تھا۔ صرف نصف بوتل چٹھانے کے بعد اتنا ہوتا کہ اس کا چہرہ

"اوائی گاڈ: یہ تو میرا پسندیدہ ترین سنگٹ ہے۔ مسٹر وصال! پلیز اس کا ایک پکیٹ مجھے بھی لادیں۔ میں پیسے دوں؟"

"پیسوں کی کیا ضرورت ہے مادام۔"

سوج کر کیا ہو جاتا۔ سرگردن پر دائیں بائیں ہلنا شروع کر دیتا اور کافی آنکھ سے پانی بہنے لگتا۔ وہ بار بار روال سے اپنی کافی آنکھ پونچھے چلے جاتا۔ ایک بار جو نس نے اس کے دائیں بائیں طوطے کی طرح گردش کرتے سر کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔

"تم قمراب پی رہے ہو یا گر جائیں نماز پڑھ رہے ہو۔ سر کو قابو میں رکھو، نہیں تو ابھی اسے اتار کر تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔"

اس پر مسز قتیہ مار کر ہنس پڑی اور اُس نے میرے ڈبے میں سے سگریٹ نکال کر
 سلا کیا۔ میں نے مسز جونز کا پہلا آدھا قتیہ آنکھیں کھول کر اور دوسرا آدھا آنکھیں بند کر
 کے سنا۔ بس اس عورت پر صرف آنکھیں بند کر کے ہی حاشق ہوا جا سکتا تھا۔ اگر یہ کہیں
 مجھے جوانی میں ملتی تو میں نے اس کے قتیہ لگوا لگوا کر اسے کب کا پاگل خانے پہنچا دیا ہوتا۔

کانا اپنی بلیغ جیسی محبوبہ کا شیدائی اور دیوانہ تھا۔ اصل مرغ کی طرح سینہ پھلا کر پر جھاڑ کر اس کے گرد چکر لگایا کرتا۔ وہ بھینگی خاتون بھی اپنے کانے رومیو کی دیوانی تھی وہ ایک آنکھ سے محبت بھری نظر اس پر ڈالتا تو وہ پے در پے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرنا شروع کر دیتی اور ٹھنڈی بخ ہو جاتی۔ ایک روز میں دفتر سے ذرا جلدی آ گیا۔ برآمدے میں سے گزرنے کا تو بڑے ہال کمرے کا دروازے کھلا تھا۔ یونی اندر نظر پڑ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ کانے صاحب صوفے کے بازو پر بیٹھے ہیں۔ صوفے پر ان کی بھینگی محبوبہ بیٹھی ہے۔ کانے صاحب نے بازو اس کی گردن میں حائل کر رکھے ہیں اور ہونٹوں سے ہونٹ پیوست ہیں۔ یعنی آپ محبت کے انتہائی روحانی دور میں تھے اور اپنی محبوبہ کا منہ چوم رہے تھے۔ چوم کیا رہے تھے کب کے چوم چکے تھے اور اب یونی بلیغ کے ہونٹوں پر رکھے ہوئے تھے۔ بلیغ کی بھینگی آنکھیں شدت خمار سے، فرط جذبات سے اور یا زیادتی کمزوری کی وجہ سے بند تھیں اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ چونکہ کانے عاشق کی کافی آنکھ میری جانب تھی، اس لئے وہ مجھے بالکل نہیں دیکھ رہا تھا۔ ویسے بھی میں ان بے چاروں کے رعبان میں مغل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اس وقت وہ دونوں ایک ایسا یتیم جوڑا معلوم ہو رہا تھا جن کا دنیا میں کوئی باقی نہ ہو۔ میں اس یتیم رعبان کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

ہماری کوشش کے لان کی دیوار ڈرٹھرداونچی تھی اور بارش کی مار کھانکا کر سیاہ پڑ گئی تھی۔ داہنی جانب پیسے کا ایک درخت تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ٹائیل کے درخت اُگے

ہونے تھے۔ عقربی دیوار پر کیلے کے چھڑے چھڑے پتوں کا سایہ تھا۔ وہاں مرغیوں کا بڑا سا ڈیرہ تھا۔ جس میں مسز جونز کی نصف درجن مرغیاں رات کو استراحت فرمایا کرتی تھیں۔ ایک بار ایک مرغی کڑکڑاتی تو مسز جونز کی کوٹھی میں رہی لیکن انڈہ دوسری کوٹھی والوں کے گیراج میں دے آئی۔ مسز جونز نے جب دیکھا کہ مرغی تو چپ ہے مگر انڈہ کمبیں نہیں، تو اُس نے سارا گھر سر پر اٹھالیا اور ڈیوڈ ایلن دونوں کو انڈے کی سراخ رسانی کو دوڑا دیا۔ ان دونوں فہرانی نوڈنوں کو خدا ایسا موقع دے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ لوگوں کی کوٹھیوں کے لان ڈھونڈ مارے بلکہ مرغی کے انڈے کی تلاش میں ناریل کے پیرٹوں پر بھی چڑھ گئے۔ آخر انہوں نے ساتھ والی کوٹھی کے گیراج میں سے اپنی مرغی کا انڈا تلاش کر لیا۔ مسز جونز نے انڈا ہاتھ میں پکڑ لیا اور اُسے یوں گھما پھرا کر دیکھنے لگی جیسے وہ کوہ نور کا ہیرا ہو۔ اُس نے مرغی کے خوب جوتے لگائے اور انڈا مرتبان میں جمع کر دیا۔

بوریلہ جنکشن کی ان کوٹھیوں کے درمیان والی سرنگ چھوٹی سی تھی۔ جس پر سرخ بزمی بھیجی ہوئی تھی۔ یہ گلی یا سرنگ آگے جا کر ختم ہوجاتی تھی۔ یہاں سے دن میں کئی بار پیسرے والے گزرا کرتے۔ وہ عجیب عجیب آوازیں لگا کر عجیب عجیب چیزیں بیچا کرتے۔ مثلاً مچھلی کا بدبودار اچار منگوستین ایک قسم کا پھل جس پر کانٹے ٹکے ہوتے وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔

چوک میں گوتم بدھ کا ایک مندر تھا۔ مندر چھوٹا سا تھا اور گول تھا۔ چاروں طرف سے بندھا۔ صرف ایک طرف دروازہ تھا۔ دیواروں پر جالیاں لگی تھیں۔ ان جالیوں میں اندر جلنے والا لوہان اور اگر بتیوں کی خوشبو باہر آیا کرتی تھی۔ جب صبح کو میں اس مندر کے قریب سے گزرتا تو مجھے تیز خوشبوؤں کے ساتھ اندر سے سنہالی زبان میں بھجن گانے کی آوازیں سنائی دیا کرتیں۔ چوک کی دوسری طرف ایک مارکیٹ تھی۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ کولمبو شہر کے ہر چوک میں اس قسم کی ایک مارکیٹ ضرور تھی۔ یہ مارکیٹیں عام طور پر صبح سے لے کر رات گئے تک کھلی رہتی تھیں اور یہاں سے سوئی کے تاگے سے لے کر چار پانی کے بان تک ہر شے دستیاب ہو جاتی تھی۔ مارکیٹ کے ساتھ میوہ منڈی تھی۔ جہاں آسم، انناس، نارمل اور کیلوں کے ڈھیر پڑے رہتے۔ اس منڈی سے میرا نوکر تنگ چار سینٹ کا ایک موٹا تازہ انناس لے کر آجاتا۔ اس نے انناس کو شاخوں سے پکڑ رکھا ہوتا۔ یوں لگتا جیسے کوئی جلازد گردن کاٹ کر اُسے بالوں سے پکڑ کر لا رہا ہو۔ پھر وہ انناس کو پلیٹ میں رکھ کر

بڑی چھری سے بڑی چابکدستی سے چاروں طرف گھما پھرا کر چھینٹا شروع کر دیا۔ اناس کو کاٹنا بڑا فنی ہے اور یہ فنی صرف کولمبو والے ہی جانتے ہیں۔ جس طرح پنجاب والے گنا پھیلنے اور کاٹنے کے فنی میں ماہر ہیں۔ بورڈلہ جنکشن کے چوک میں چار کی بجائے پانچ سڑکیں پھٹی تھیں۔ ایک سڑک گال روڈ کی طرف ٹکل گئی تھی۔ دوسری ریڈیو سیلون یعنی میونسپل ہال کی طرف جاتی تھی۔ تیسری کولمبو سے آگے دوسرے مصافحاتی شہروں کی طرف چلی گئی تھی چوتھی سمندر کی طرف اور پانچویں شہر کے وسط کی طرف جاتی تھی۔ یہاں سے ٹرام صرف تین سڑکوں پر چلتی تھی۔ باقی دونوں سڑکوں پر ٹرام کی بجائے بجلی کی ایک منزل اور دو منزل بسیں چلا کرتی تھیں۔

ریڈیو سیلون کی عمارت دو منزلہ تھی اور اس کے اندر بیچ والے لان میں شریفیے کا ایک درخت آگاہوا تھا۔ ریڈیو سی ایک سیلون امریکی اور ہندوستانی محکموں میں منقسم تھا۔ ہندی سیکشن کے انچارج میجر حامد تھے اور امریکی سیکشن کے کرنل رائٹ انچارج تھے۔ ویسے تو امریکی اناؤنسر کئی ایک تھے۔ لیکن مس کیشی کا جواب نہیں تھا۔ یہ بھرپور جوان امریکی عورت دو خاوند مار چکی تھی۔ اب اُس سے ہر کوئی شادی کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ دوست اُس کے سبھی تھے۔ لیکن خاوند کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے بال سنہری تھے، چہرہ گول اور سرخ و سپید تھا، آنکھیں نیلی تھیں اور ان میں بحیرہ روم کی نیگیوں گھرائیاں چھپی ہوئی تھیں۔ ہماری مدراسی اناؤنسر مس لکشی کو دیکھ کر بھوت پریت کا خیال آ جاتا تھا۔ وہ سوکھی ساکھی چمرخی سی تھی، رنگ سیاہ، آنکھیں نسواری اور قد لمبا تھا۔ لگڑ لگڑ کی طرح چلتی اور بالوں میں پھول لگانے کبھی نہ بھولتی۔ اس کی آواز بڑی اچھی تھی۔ اس آواز نے کئی مدراسی نوجوانوں کے خرم غزل و ہوش میں آگ لگائی تھی۔ وہ جذبہ عشق میں ہرشار ہو کر کٹاں کٹاں ریڈیو سیلون کی طرف آتے اور مس لکشی کے درشن کرنے کے بعد روئے پیٹے بال نوچتے واپس ہوتے۔

میجر حامد کی سیکرٹری نے ہمارے سیکشن کے سبھی جوانوں کو مسودہ کر رکھا تھا۔ حوالدار موہن سنگھ، صوبیدار بوستان خان اور حوالدار پرکاش سبھی اُس سے درپردہ عشق کر رہے تھے اور اس سے ہنس کر بات کرتے تھے۔ اس کا نام مس روتھ تھا۔ وہ ایٹھو سیلونی عورت تھی۔ جسم گداز اور سینہ بری طرح ابھرا ہوا تھا۔ اس اُبھرے ہوئے سینے نے کئی دل

والوں کو ڈبو کر رکھ دیا تھا۔ سینے کی دو چوٹیاں ہر کوہ پیمہ کو اپنی طرف بلایا کرتیں۔ حسبِ عادت میں نے جاتے ہی مس روتھ اور مس کیشی دونوں سے عشق شروع کر دیا۔ اور تو اور میں نے مس لکشی کو بھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ ایک روز وہ ریکارڈوں کا سپیڈ ٹسٹر لینے میرے سٹوڈیو میں آ گئی۔ پروگرام شروع نہیں ہوا تھا۔ میں کچھ پنجابی گانوں کی ڈسکیں دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بڑی نرم آواز میں ہندوستانی میں مجھ سے سپیڈ ٹسٹر مانگا۔

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ میں نے ہیڈ فون اتار کر کہا۔

"مس لکشی ایک بات کہوں؟"

"بھو۔"

"برا تو نہیں مانو گی۔"

"جی نہیں۔"

"جب تم مسکراتی ہو تو مجھے مدراس کے جھگول میں کھلے ہوئے کنول کے پھول یاد آ جاتے ہیں۔"

لکشی فرما گئی اور پہلے سے زیادہ بد صورت معلوم ہونے لگی۔ میں نے سپیڈ ٹسٹر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس کا ہاتھ ذرا سادبا دیا۔ اس نے فرما کر منہ دوسری طرف کر لیا اور ساڑھی کا پلو دانٹوں سے دبا کر باہر ٹکل گئی۔ دوسری بار جب ہمیں تنہائی کا موقع ملا تو میں نے اُسے صاف صاف کہہ دیا۔

"مس لکشی مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے۔"

"اوتی پریم؟"

"ہاں لکشی پریم! جسے کچھ لوگ ہمارے ہاں پریم چند اور پریم ناتھ بھی کہتے ہیں۔"

لکشی فرم سے پانی پانی ہو گئی اور مجھے اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا کہ کجمنیت یہ کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے لکڑے کو ہتھیلی پر اٹھایا ہو۔ لکشی لالچ کی ماری دہری ہو گئی۔ میں نے کیرٹا ہاتھ سے جھوڑ دیا۔ بہر حال لکشی کو یقین ہو گیا کہ میں اُس پر جان دیتا ہوں۔ وہ اب بڑی بن سنور کر دفتر آتی اور ہر روز ایک نئی ساڑھی بدلتی۔ میری طرف بڑے خرم سے دیکھتی اور بات بات پر فرمانے کی کوشش کرتی۔ ادھر میجر صاحب کی سیکرٹری مس روتھ کی طرف بھی میں نے پیش ہدی شروع کر دی۔ وہاں ذرا

روتہ نے بھی کچھ زیادہ پی لی تھی۔ اور وہ مسز جونز اور مسٹر جونز سے فرخ باتیں کئے جا رہی تھیں۔ انہیں اپنے معاشقے اور پہلے خاوند کی احمقانہ باتیں سنارہی تھی۔ کبھی میری طرف دیکھ کر مسکراتی اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی۔

"وصی! تم مگر مٹ ہو۔ تم ابھی بچے ہو۔ زندگی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ کیا تم نے کبھی عشق کیا ہے۔"

میں نے دیکھا مسز جونز اور مسٹر جونز میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ کانٹا کزن شراب کے نشے میں دھت تھا اور اپنے خیال میں گن گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے ہاتھ مل رہا تھا۔ میں نے مگر مٹ سکا کر روتہ کی آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر کہا۔

"مجھے تو تم سے عشق ہو گیا ہے۔"

میں نے شراب کے نشے کا جائز فائدہ اٹھایا تھا۔ روتہ قہقہہ لاکر ہنس پر مٹی۔ سب ہنسنے لگے۔ مسز جونز نے بھی قہقہہ لگایا۔ گھنٹیاں ہی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ روتہ نے سینہ پھلا کر کہا۔

"اوائی ڈیر بوائے۔ آئی ٹو لویو۔؟"

اور اس کے ساتھ ہی اُس نے سب کے سامنے میرا بورے لے لیا۔ اس کے شراب آلود ہونٹوں کا دباؤ موس کر کے میں بیدار سا ہو گیا اور میرا آدھا نشہ بہر ہو گیا اور آنکھیں جلنے لگیں۔ میرا جی چاہا کہ روتہ کو توڑ مروڑ کر چکنا چور کر دوں اور اٹھا کر سمندر میں پھینک دوں۔ روتہ کے بورے لینے پر سب نے تالیاں بجا کر ہماری محبت کا اعلان کر دیا۔

رات گئے تک یہ خوبصورت محفل جاری رہی۔ میں روتہ کو چھوڑنے اُس کے گھر تک گیا۔ ہم دونوں سٹیشن دیگن کی پھلتی خستوں پر بیٹھے تھے۔ روتہ کے گرم جسم میں سے شراب کا سینک اُٹھ رہا تھا۔ اس کی نیم گرم سلکتی ہوئی شرابی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے سینے کا اُچار طوفانی لہر کی طرح کبھی اوپر اُٹھ رہا تھا اور کبھی نیچے گر رہا تھا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور جسم کا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ روتہ نے اپنی بائیں میرے گلے میں عمائل کر دیں۔ میں نے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے ریشم کے سرہانے کو اپنے ساتھ لگایا ہو۔ ہم گال روڈ پر جا رہے تھے۔ ہمیں بائیں جانب شوریدہ سر سمندر کی لہروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے ہونٹ ایک دوسرے کے ہونٹوں میں

معاملہ مثل تھا۔ کیونکہ دفتر کے عملے کے علاوہ امریکی محکمے کے دفتر کا سارا عملہ بھی اُس پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ بلکہ کئی ایک تو ڈورے ڈال کر روتہ کو جکڑ بھی چکے تھے۔ روتہ پر مٹی فیاض قسم کی عورت تھی۔ ہر ایک کا جی خوش کر دیا کرتی۔ ہر ایک کی بات کا جواب ہنس کر دیتی اور سانس پھلا کر سینے کا اُچار مزید اونچا کر دیتی۔

ہمارے میجر حامد کے ساتھ وہ گال مینس ہوٹل میں کھانا کھانے چلی جایا کرتی تھی۔ ہمارے میجر صاحب بھی روتہ سے عشق کرنے میں کسی سے چھپے نہیں تھے۔ انہوں نے تو امریکی اناؤنسر مس کیٹی کو بھی اپنے دام تزویر میں پھنسا رکھا تھا۔ میں نے ایک بار ان دونوں کو کولمبو کے ایک ہوٹل میں ڈانس کرتے اور دو بار سوڈو نمبر 7 میں ایک دوسرے کا منہ چومنے دیکھا تھا۔

جو میں اچانک میجر حامد کے کمرے میں داخل ہوا تو آپ نے اپنی سیکرٹری مس روتہ کو زانوں پر بٹھا رکھا تھا۔ اور اُس کے سینے کی چوٹیوں پر اپنا ناک رگڑ رہے تھے۔ میں اٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ میرے تن بدن میں انگارے دھکنے لگے تھے۔ اُس دن کے بعد میں نے روتہ کی طرف باقاعدہ پیش قدمی شروع کر دی۔ اُسے واسن اور پھولوں کا تحفہ پیش کر دیا جو اُس نے مسکرا کر قبول کر لیا۔ دو روز بعد میں نے اُسے اپنے گھر کھانے پر بلالیا۔ ہفتے کی شام تھی۔ میں نے مسز جونز اور مسٹر جونز کو بھی دعوت میں شریک کر لیا تھا۔ انہوں نے خالص انگریزی کھانے تیلہ کئے تھے۔ مسز جونز تو ایک اہر خانہ مال کی طرح ہر کیتلی کا ڈھکنا اٹھا کر سالن چمکتی اور سر ہلا کر اپنے بہترین باورچی ہونے کا خود ہی اعتراف کرتی جاتی۔ مس روتہ بڑا بھر پور لباس پہن کر شام ہی کو آگئی۔ رات کے نو بجے تک شراب کا دور چلتا رہا۔ جونز اور مسز جونز نے خوب پی لی۔ کہیں سے ان کا کانٹا کزن بھی آگیا۔ کم نعت کو بہترین کھانوں اور شراب کی بود و کوس سے وہاں کھینچ کر لے آئی۔ اعلیٰ قسم کی شرابیں اور کھانے میز پر چنے دیکھے تو اُس کی کافی آنکھ پھٹنے لگی۔ وہ ہاتھ ملتا ہوا میز پر بیٹھ گیا اور دیکھتے دیکھتے شراب کا پورا گلاس ہضم کر گیا۔

تعارف کروانے کے بعد بھی وہ گھٹنا بن کر بیٹھا رہا اور ہاتھ ملتا اور کافی آنکھ کو پھر کا پھر کا شراب کے گلاس پر گلاس چڑھاتا رہا۔ سات پیگ پینے کے بعد اُس نے اپنی گردن طوطے کی طرح ہلائی شروع کر دی۔ کھانے پر اُس نے وہ ہاتھ دیکھائے کہ میں دنگ رہ گیا۔

پیوست تھے اور جسم ایک دوسرے کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ اچانک سٹیشن ویگن ایک کوٹھی میں داخل ہو کر رک گئی۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ میں نے روتہ کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکالا۔ میں اسے ساتھ لے کر کوٹھی کے بنگلے دروازے کی طرف آ گیا۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے لگی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے رات وہیں بسر کرنے کی دعوت دے دے۔ شاید اس نے میری اس خواہش کو میری آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہو گئی اور میرا منہ چوم کر بولی:

"شب بخیر وصی! پھر کسی روز سہی، اس روز میں تمہاری دعوت کروں گی۔ شب بخیر۔"

اس کے ساتھ ہی اپنے کمرے میں داخل ہو کر کھینچی عورت نے دروازہ بند کر دیا اور میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ سٹیشن ویگن میں بیٹھ کر واپس لوٹنے پر توجہ دیکھتا ہوں کہ مسز جونز برآمدے کے فرش پر بیٹھی ہے۔ اپنے بچوں کو نیند سے اٹھا کر پاس بٹلار کھا رہے ہیں۔ اور انہیں زبردستی سوٹ اور دوسرے سکے دے رہی ہے۔ انہیں پیار کر رہی ہے اور رو رہی ہے۔ مسٹر جونز باغ والی آرام کرسی پر پڑے پڑے سو گئے ہیں اور خراٹے لے رہے ہیں۔ کانا کرن وہاں شراب کی بچی ہوتی بوتل بزل میں دبا کر نو دو گیارہ ہو چکا ہے۔ مسز جونز نے مجھے آتا دیکھا تو مسکرا کر بولی:

"وصی! یہ میرے سچے ہیں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں۔ میری یہی جائیداد ہے۔ میری سات کوٹھیاں ہیں۔ لیکن مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں۔ ان میں سے کوئی میرے ڈیوٹ اور ایلن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

اور پھر ایلن کو بچکار کر کھنے لگی۔

"یہ لو ایلن! ایک چوٹی اور لے لو بس ایک چوٹی اور لے لو۔"

میں جانتا تھا کہ وہ صبح کو ساری چوٹیاں اُس سے رکھوا لے گی۔ سچے بھی اس انجام سے پوری طرح واقف تھے۔ اسی لئے وہ کسی قسم کی خوشی کا اظہار کئے بغیر چوٹیاں اپنی جیبوں میں ڈالے جا رہے تھے۔ جیسے کسی کی امانت منجھال کر رکھ رہے ہوں۔

مسز جونز نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا:

"مسٹر وصی! میں تمہاری بڑی شکر گزار ہوں کہ تم بڑے اچھے ہوں۔ مجھے تم ایسا ہمایہ کبھی نہیں ملے گا۔ تم نے آج دعوت پر بڑا روپیہ خرچ کر دیا۔ مس روتہ بڑی سوٹ عورت

ہے۔ کیا تم بھی اس سے محبت کرتے ہو؟ ویری فائن اچھا مسٹر وصی! تمہارے پاس سنگھٹ ہوں گے؟"

میں نے اپنے کمرے میں جا کر الماری میں سے سینٹر سروس کی پوری ڈبیا لا کر مسز جونز کو دے دی۔ اس عورت نے ڈبیا لے کر میرا شکریہ ادا کیا اور ہاتھ چوم لیا اور پھر اپنے بچوں سے باتیں شروع کر دیں۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کپڑے اتار کر صوفے پر پھینکے۔ پانی کا پورا ایک جگ پیا۔ بتی گل کی اور پلنگ پر گرے ہی سو گیا۔

میرا شروع ہی سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ صبح کی سیر انسان کی صحت کے لئے بڑی مفید ہے۔ میں امرتسر میں صبح کی سیر ضرور کیا کرتا تھا۔ کولمبو میں آ کر میں نے سوچا یہاں بھی سیر کا شغل جاری رکھنا چاہیے۔ ایک روز میں منہ اندھیرے اٹھا اور بوریلر چوک میں آ کر اس سڑک پر چل نکلا جو کولمبو کے مصافقات کو چلی گئی تھی۔ امرتسر میں کھیتوں کی کھلی فضاؤں میں سیر کرنے کا عادی تھا۔ لیکن یہاں کوٹھیوں کا سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ ان کوٹھیوں میں کئی جگہ باورچی خانوں میں چولے روشن تھے۔ اور مٹی کے تیل کی بوتلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کھیں کھیں دودکش سے دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔

علاوہ ازیں پھولوں اور سبزے کے مہک کی بجائے ہاسی مچھلی کی بو ہوا میں رہی ہوئی تھی۔ میں تھوڑی ہی دور جا کر واپس آ گیا۔ اس کے بعد میں نے صبح کی سیر کا کبھی نام نہ لیا۔ دراصل صبح ہمیشہ جنگل کی اور شام ہمیشہ شہر کی خوبصورت ہوتی ہے۔ شام کو چاروں طرف روشنیوں کا سیلاب اُٹھ آتا اور کولمبو کی سڑکیں دلن کی طرح آراستہ ہو جاتیں۔ اگر بارش ہو رہی ہوتی تو شام کا حسن دو بالا ہو جاتا۔ کولمبو میں بارشیں بڑی زوردار اور موسلا دھار ہوتی تھیں۔ ابھی دھوپ ٹھکی ہوئی ہے اور ابھی بادل چھا گئے ہیں اور چھا جوں پانی برسے گا ہے۔

بدھی بھکتو اور بھکشین زرد دھوتیاں پہنے کیلے کے چوڑے پتوں کی چھتری سر پر پھیلائے فٹ پاتھ پر سے گزرا کرتے۔ کھیں کوئی عورت پان کی ٹوکری اٹھائے چلی جا رہی ہے۔ کھیں کوئی آدمی کیلے اور انناس سے بھرا ہوا ٹوکرا سر پر رکھے منڈی کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔ مصافقات کو جانے والی بسیں پرانی طرز کی تھیں اور مسافروں سے ٹھنسی ہوتی ہوتی تھیں۔ انہیں شہر کی خوبصورت اور جدید سڑکوں پر سے گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ وہ جلے ہوئے تیل کے دھوئیں کے بادل اڑاتی جاتی تھیں۔ کولمبو شہر کی سب سے بڑی

تھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا:

"بڑی زبردست عورت ہے یار کون ہے یہ؟"

میں نے اسے بتایا:

"کولمبو کی ٹائٹ کلب کی مشہور ڈانسر ہے۔ ایک ہفتہ ہوا امریکہ سے آئی ہے۔"

"تمہاری دوست ہے کیا؟"

"اور نہیں تو کیا یونہی ہاتھ ہلا رہی تھی۔؟"

میرے دوست کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا:

"تو پھر یار کسی روز ٹائٹ کلب میں چل کر اس کا ڈانس دیکھا جائے۔"

میں نے کہا:

"اس کا کیا فائدہ۔"

"ذرا تعارف ہو جائے گا۔"

میں نے کہا:

"بکواس بند کرو۔"

جانے کیوں میں نے اپنے دوست کو روتھ کے بارے میں غلط اطلاع دی۔ دراصل روتھ کا جسم اتنا بھرپور، بھرا بھرا، صحت مند اور پکے ہوئے پھل کی طرح تھا کہ مجھے بے اختیار رات کی کلبوں میں ابھرے ہوئے پنٹوں والی اور گداز جسموں والی ڈانسرز کا خیال آ گیا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر روتھ کے اس رات والے بوسے کی گرمی اور خوشبو محسوس کی۔ میرا بدن گرم ہو کر سلگنے لگا۔

اور مشہور ترین سرنگ کا نام گال تھا۔ گال روڈ جیسا کہ کہا جاتا ہے کوئی پچاس میل لمبی تھی۔ کچھ دور تک وہ شہر کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ جب شہر ساتھ چھوڑ دیتا تو وہ دوسرے شہروں کی طرف کھلتی چلی گئی تھی۔ یہ سرنگ سمندر کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ دونوں طرف عالی شان عمارتیں اور خوبصورت کونٹیاں کھڑی تھیں۔ ناریل، تار اور سرخ پھولوں والے ایک خاص قسم کے درختوں کی بھی بھرمار تھی۔ پچاس ساٹھ گز چوڑی سرنگ تھی۔ اسی کے راستے میں کولمبو کا مشہور بیچ تھا اور ماؤنٹ لیونیا ہوٹل بھی تھا۔

ماؤنٹ لیونیا ہوٹل سمندر کے کنارے واقع تھا۔ داہنی جانب کھلا بیچ پھیلا ہوا تھا۔ سمندر کی لہریں بڑی دور دور سے آتی اور ساحل سمندر کے اوپر چڑھ کر دور تک پھیلتی چلی جاتیں۔ کنارے کنارے ناریل اور تار کے درختوں کا جنگل سا اگا ہوا تھا۔ سمندر کی لہریں ان درختوں کے تنوں کا منہ دھلا کر واپس سمندر میں چلی جاتیں۔ یہاں شام کو عورتیں مرد اور بچے نہانے آیا کرتے۔ یورپی عورتوں کا ایک ہجوم ہوتا۔ انہوں نے نہانے کا لباس پہن رکھا ہوتا اور ڈوبتے سورج کی ارغوانی روشنی میں ان کے سپید سپید جسم چمک رہے ہوتے۔ سمندر کی لہریں جب ان کی ٹانگوں سے ٹکراتیں تو وہ اچھل کر ان لہروں پر سوار ہو جاتیں۔ اور ساحل کی طرف کھسکنا شروع کر دیتیں۔ پھر وہ تیرتی ہوئی سمندر میں آگے نکل جاتیں۔ یہاں میں نے ایک روز اپنے دفتر کی سیکرٹری مس روتھ کو نہاتے دیکھا۔ اس کے ساتھ امریکی سیکشن کا اناؤنسر پول بھی تھا۔ پول دبلا پتلا امریکی لڑکا تھا جو ریڈیو پر مختلف ملکوں کی دلچسپ رسعات کے بارے میں تقریریں بھی کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے سے پوچھا:

"مسٹر وھی! یہ لفظ پنجاب ہے یا پنجاب؟"

روتھ نے بیدنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور وہ بے حد عریاں تھی۔ میں لیونیا ہوٹل کے ٹیرس پر اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ روتھ کے سینے کا ابھار بڑا نمایاں ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنے انگلیا کے نیچے دو بڑے بڑے خربوزے چھپا رکھے ہیں۔ میں ان خربوزوں کو ہی دیکھتا رہا۔ نہانے سے فارغ ہو کر روتھ تولنے میں اپنا آپ لپیٹے جب ہمارے قریب سے گزری تو اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ میں کرسی پر بیٹھا بیٹھا ہل گیا۔ خربوزوں کی خوشبو نے مجھے مسحور کر دیا۔ میں نے بھی مسکرا کر اپنا ہاتھ ہلایا۔ میرے دوست نے جو پیٹھ کے کاروباری علاقے سے تعلق رکھتا تھا اور حیدر آباد دکن کا

(3)

بوریلہ جنکشن والے چوک سے ایک سرنگ لائن ٹاور کی طرف جاتی تھی۔

اس سرنگ کے پہلے چوک میں گوتم بدھ کا ایک مندر تھا۔ مندر کی سیرمیاں چڑھ کر لوگ اوپر جاتے۔ میں اس مندر میں کبھی نہیں گیا تھا۔ ٹرام پر چوک میں سے گزرتے ہوئے میں نے اس کی سیرمیاں پر بورمھی سنہالی عورتوں کو موتیا، چمبہ اور کنول کے پھول بیچتے دیکھا تھا۔ ایک روز ٹرام میں بیٹھا وہاں سے گزر رہا تھا۔ ٹرام بڑی تیزی سے گزر رہی تھی۔ ابھی چوک نہیں آیا تھا کہ میں نے ایک مکان کے لکڑی کے ستونوں والے برآمدے میں ایک لڑکی کو دیکھا۔ اس علاقے میں متوسط طبقے کے خوش حال سنہالی آباد تھے۔ ان میں نوکر پیشہ اور وکیلوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ہر مکان کے آگے لکڑی کا برآمدہ تھا۔ لکڑی کا جھگلا لگا تھا۔ اور کہیں کہیں اس جھگلے پر عشق پھال کی بیل چڑھی ہوتی تھی۔ میں ٹرام میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ میں نے دیکھا ایک مکان کے برآمدے میں کھڑی لڑکی جھگلے کے اوپر سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ لڑکی کا رنگ گہرا سا نولا تھا۔ ماتھے پر سرخ بندیا چمک رہی تھی۔ وہ میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میرا سگریٹ ہونٹوں کے پاس ہی آکر رک گیا اور میں بھی اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اور ٹرام آگے نکل گئے۔ لڑکی جھگلے کے ساتھ لگی نکلتی چلی گئی۔ میں کچھ حیران سا ہو رہا تھا۔ آخر یہ لڑکی کون ہے؟ یہ مجھے اتنی دلچسپی سے کیوں دیکھ رہی تھی۔ میں نے تو اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں اس سے ہزاروں میل دور ایک دور افتادہ شہر میں پیدا ہوا۔ وہیں بڑھا پلا، کبھی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر ان خاموش آنکھوں میں یہ دوستی کی چمک کیسی تھی؟ بہر حال میں واپسی پر پھر اسی سرنگ پر سے گزرا مگر اس وقت وہ لڑکی وہاں موجود نہیں تھی۔ دوسرے روز ٹھیک اسی وقت پر میں پھر ٹرام پر سوا ہوا کہ وہاں سے گزرا۔ وہ لڑکی برآمدے میں کھڑی شیا چڑیوں کو چاول ڈال رہی تھی۔ اس نے گہروں ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بال شانوں پر کھلے تھے اور ماتھے پر بندیا لگی تھی۔

ہماری آنکھیں ایک بار پھر چار ہوئیں اور ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یہاں

تک کہ ٹرام گزر گئی اور ہم ایک دوسرے سے اوچھل ہو گئے۔ میرے شوق کو ہوا لگی۔ اور میں نے اس لڑکی سے عشق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز میں صبح کو پیدل ہی پھل روڈ پر اس لڑکی کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا ریسٹوران تھا جس کے کاؤنٹر پر بیٹے کے مرتبانوں کے پیچھے ایک مدراسی بیٹھا تلگو گانوں کے ریکارڈ لگا کر تھا۔ میں اس ریسٹوران میں آکر بیٹھ گیا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے اس لڑکی کے گھر کا برآمدہ اور دروازے پر گرا ہوا سرخ پردہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لڑکی وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے کافی منگوالی اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ اس کافی میں ناریل کا دودھ پڑا تھا۔ میں نے سگریٹ سگایا اور اسے پیتے ہوئے لڑکی کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ٹرام تیزی سے ٹن ٹن کرتی گزر گئی۔ جب ٹرام آنکھوں کے سامنے سے ہٹی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی سانولے رنگ کی لڑکی برآمدے میں لکڑی کے ستون کا سہارا لئے چپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ دور جاتی ٹرام کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کچھ اداس اداس تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاسی کی تالی تھی۔ جس میں چاول پڑے تھے۔ وہ چڑیوں کے لئے زمین پر چاول بکھیرنے لگی۔ چاول بکھیرتے ہوئے اچانک اس کی نگاہیں مجھ سے چار ہو گئیں۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اور حلق خشک ہو گیا۔ شاید وہ مجھے ٹرام میں تلاش کر رہی تھی۔ اور اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ میں اس کے گھر کے بالکل سامنے ریسٹوران میں بیٹھا اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں گا۔ اس کے چہرے پر بڑا دلکش تبسم ابھر آیا۔ وہ جلدی سے اندر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر واپس آئی تو اس نے بالوں کا جوڑا بتا لیا تھا اور اس جوڑے میں کنول کا ایک پھول مسکرا رہا تھا۔ اس نے گیلی ساڑھی کو نیچر کر جھگلے پر ڈالا اور برآمدے میں پڑی ہوئی بانس کی کرسی پر بیٹھ گئی اور آنکھوں سے مجھے دیکھنے اور زیر لب مسکرانے لگی۔ اتنے میں ایک ادھیر عمر کا آدمی جس نے کالا کوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں چھڑی تھی۔ آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک لگی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ وہ لڑکی کھڑی ہو گئی اور اس نے ساڑھی کا پلو سر پر کر لیا۔ معلوم ہوا کہ یہ اس کا باپ ہے۔ اس آدمی نے چھڑی اٹھا کر جھگلے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا دو ایک باتیں کہیں اور باہر کی سرنگ پر آ گیا۔ سرنگ پر وہ ایک رکشے میں سوار ہوا اور بوریلہ چوک کے طرف چلا گیا۔

وہ لڑکی پھر کرسی پر بیٹھ گئی اور میز پر رکھا ہوا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔ اخبار اس نے

"بادل چھا رہے ہیں شاید آج بارش ہو۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اندر سے اس کی ماما جو نے اسے آواز دی وہ بھاگ کر اندر چلی گئی۔ مجھے پسینہ آ گیا۔ میں جلدی سے فٹ پاتھ پر آگے پل پڑا۔ بوریلہ چوک میں آ کر میں نے بس پکڑی اور سیدھا اپنے دفتر آ گیا۔ سارا راستہ اس عجیب و غریب لڑکی کے عجیب و

اس کے ساتھ ہی وہ مسکرانے لگی۔

ریکارڈ ختم ہو رہا تھا۔ میں نے فون بند کر دیا۔ ٹرانسمیشن ختم کر کے جب میں سٹوڈیو سے باہر نکل کر اپنے دفتر میں آیا تو ہاں ریکارڈوں والے ریک کے پاس بھی کرسیوں پر چھ عدد بچے اور تین جوان بپتی دہلی لڑکیاں بیٹھی لیمن پی رہی تھیں۔ ان میں گل زیب بھی تھی۔ بچے حاجی جبار کے کنبے کے تھے اور باقی دو لڑکیاں گل زیب کی سیدیاں تھیں۔ ریڈیو سیلون کا پروگرام اگرچہ فوجیوں کے لئے مخصوص تھا مگر کولمبو کی ہندوستانی آبادی میں بے حد مقبول

میں نے کہا:

"غلط فہمی ہوتی ہے تو ہو جانے دو۔ اس میں تمہارا کیا بگڑتا ہے اور پھر ذرا دو باتیں کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

بھالی لڑکیاں ہماری پنجابی بول چال سے تنگ آ چکی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے گل زنب سے انگریزی میں کہا:

"بھئی تم لوگ کیا آپس میں باتیں کرنے لگے۔ پھر کسی وقت یہ مسئلہ حل کر لینا۔ ابھی تو ہمیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔"

ہم سب ہنس بڑے اور میں ان لوگوں کو لے کر دوسرے سٹوڈیو میں آ گیا۔

شام کو گھر میں غسل کیا بھالی وضع کا سفید دھوتی کرتہ اور سیاہ چپل پہنی۔ ٹرام میں بیٹھ کر ٹمپل روڈ والے مندر میں آ گیا۔ مندر کے باہر روشنیاں ہو رہی تھیں۔ سیر مھیوں پر عورتیں پھول بیچ رہی تھیں۔ پجاری عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے اور لڑکیاں پھولوں کے گلدستے اور اگر بتیاں لے کر سیر مھیاں چڑھتی مندر میں جا رہی تھیں۔ میں نے ایک طرف کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ مگر وہ سانولی لڑکی مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ میں نے سوچا شاید وہ مندر میں چلی گئی ہے۔ میں نے کنول کے پھولوں کا ایک گچھا خریدا اور سیر مھیوں پر سے ہو کر مندر میں آ گیا۔ پہلے چبوترے کی نیبی چست سے لگتا ہوا گھنٹہ ایک ہاتھ سے بجایا۔ پجاری نے آگے بڑھ کر میرے ماتھے پر تنک لگایا۔ میں نے چار سینٹ کا سکہ صندوقچی میں ڈالا اور مندر کے اندر آ گیا۔

مندر اندر سے بڑا خوبصورت اور شاندار تھا۔ گوتم بدھ کی چھ سات چھوٹی چھوٹی مورتیاں ایک قطار میں بڑے سے استکان پر رکھی تھیں۔ درمیان میں ایک بہت بڑا بدھ کا بُت تھا۔ یہ بُت کانسی کا تھا اور بجلی کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دو بڑے سبز رنگ کے موتی جھللا رہے تھے۔ اس بُت کے چہرے پر ایک عجیب و غریب جلال اور ہیبت تھی۔ پجاری بُت کے پاس کھڑا لوگوں سے دکھڑنا وصول کر رہا تھا۔ انہیں اگر بتیاں پھول اور بتا شے دے رہا تھا۔ پجاری چبوترے کے پاس جا کر بڑے بُت کے آگے جھکتے، ماتھا ٹیکتے، اُس کے قدموں میں اگر بتیاں سلگاتے، پھول رکھتے اور دعائیں مانگتے واپس ہو جاتے۔

میں ایک طرف پتھر کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ میں اس بُت کے

آگے سجدہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ خود گوتم بدھ نے اس کام سے منع کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ میں اپنے آپ کو گوتم بدھ سے چھوٹا آدمی نہیں سمجھتا۔ پھر میں اس کے آگے سجدہ کیوں کروں؟ بدھ عظیم انسان تھا۔ اس لئے کہ اس نے غریبوں کے دکھ درد کو محسوس کیا اور انسان کی خاطر اپنے مخلوق کا عیش و آرام چھوڑ دیا۔ اپنی بیوی اور بچہ چھوڑ دیا۔ میں اس شخص کی عظمت کا مداح ہوں۔ اس کی حیرت انگیز انسانی ہمدردی کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ مگر اس کی پوجا نہیں کر سکتا۔

میں تو بدھ کے مندر میں اپنی سانولی محبوبہ کی تلاش میں آیا تھا۔ میں بے قرار نظروں سے مندر میں ہر آنے جانے والی کو دیکھ رہا تھا۔ ہر قسم کی عورت وہاں موجود تھی۔ مگر وہ سانولی لڑکی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہیں وہ بھول تو نہیں گئی؟ کہیں اس نے کسی دوسرے مندر کا تو نہیں سمجھا تھا؟ لیکن اس علاقے میں سوائے اس مندر کے اور کوئی مندر نہیں تھا؟ وہ یقیناً آئے گی۔ اس مندر میں آئے گی۔ اسے دل ابھی کچھ دیر مزید انتظار کر!۔۔۔۔۔ جی چاہا کہ سنگریٹ سگالوں تاکہ انتظار کی کلفت کچھ تو کم ہو مگر مندر میں سنگریٹ نہیں پایا جاسکتا تھا۔ پھولی ہوئی توند والے موٹے منٹ کے اشوک پڑھنے کی آواز میرے کان میں آرہی تھی۔

اب کچھ عورتوں نے سنہالی زبان میں بگوان بدھ کی تعریف میں بھجن گانے شروع کر دیئے تھے۔ ان کی آوازیں ہر سکون سمندر کی ہلکی ہلکی لہروں کی طرح اٹھ رہی تھیں اور میرے کانوں سے نگرا کر بڑی نرمی سے واپس چلی جاتی تھیں۔ ان کے ساتھ مردنگ اور چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ مندر کی فضاء اگر بتیوں، لوہان، پھولوں اور جوان عورتوں کے صحت مند پسینوں کی بوؤں سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ ایک پل کے لئے تو میرا سر چکرانے لگا۔ میں ستون پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور مندر کے صحن میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ شام گھری ہو رہی تھی اور آسمان پر بادل یوں جھکے ہوئے تھے کہ اب برے کہ برے۔ ہوا ایک تخت بند ہو گئی تھی اور فضاء میں جسب ہو گیا تھا۔ میں ناامید ہو گیا۔ اب وہ لڑکی نہیں آئے گی۔ اب اس کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اداس ہو کر صحن سے ہو کر مندر کی سیر مھیوں کی طرف آ گیا۔ ابھی میں گھنٹے والے چبوترے میں ہی تھا کہ میں نے دیکھا وہی گھرے سانولے رنگ کی لڑکی کانسی کی چھوٹی سی تھالی میں لوہان اور کنول کی ادھ کھلی کلیاں رکھے سفید ساڑھی

کا دامن سنبالے آہستہ آہستہ مندر کی سیرٹھیاں چڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں چبوترے کے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا اور ان لوگوں کی طرح بار بار گھنٹے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جنہیں گو تم بدھ سے بڑی محبت ہوتی ہے۔

چبوترے پر آکر اس نے مجھے دیکھا اور نظریں چمپا کر چپکے سے مندر کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی مندر میں چلا گیا۔ اس نے میرے سامنے بدھ کے چرنوں میں اگر بتیاں روشن کیں۔ پھول رکھے۔ ماتھا ٹیکا۔ بدھ کے قدموں کی راکھ لے کر اپنی مانگ میں لگائی اور چھوٹی مورتیوں کے گرد چکر لگانے لگی۔ میں وہاں سے کھسک کر باہر صحن میں آ گیا۔ کیونکہ بجاری کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا جو اس سے پہلے مجھے وہاں دیکھ چکا تھا۔ صحن میں آکر ایک ستون کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لڑکی مندر کی ڈیوڑھی سے باہر نکل رہی تھی۔ دبلیز کے پاس ایک پل کے لیے رک کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ مجھ سے نظریں چار ہوئیں تو چپکے سے نگاہیں جھکا لیں اور صحن کی پرلی جانب کو چل دی۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ اب وہ مندر کے چھوٹے چھوٹے ستونوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ اس کے بالوں کے جوڑے میں سفید پھول لگے تھے اور جسم سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس خوشبو کی لہریں مجھ تک آرہی تھیں۔ میں اس کے قریب ہو گیا۔ ایک جگہ صحن میں کسی بدھی بکشو کا چھوٹا سا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ لڑکی اس مجسمے کے پاس جا کر رک گئی اور ذرا سا جھک کر اس کے قدموں میں پھولوں کی کھیاں ارپن کرنے لگی۔ میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کو میرے اتنا قریب ہونے کا شدید احساس تھا اور وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ اس کا گھرا سا نولا رنگ سلگ رہا تھا۔ ماتھے پر بندیا چمک رہی تھی۔ اور ہونٹوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے لرز رہے تھے۔ میں نے جھک کر اس کی تنالی میں سے کنول کی ایک کھلی اٹھائی اور اسے چوم کر بت کی قدموں پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے دیر کر دی۔"

لڑکی کچھ نہ بولی۔ اس نے گھرا سانس لیا آنکھیں اٹھا کر گھری اور گرم نظروں سے میری طرف دیکھا اور آگے چل دی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اب ہم جہاں سے گزر رہے تھے وہاں روشنیاں کم تھیں اور ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس لڑکی کا بازو تھام لیا۔ وہ کانپ گئی اور وہیں رک گئی۔ اس کا بازو گداز تھا۔ اور گرم ہو رہا تھا۔

"تم کون ہو؟"

میرے اس سوال پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی نسواری آنکھوں میں اجنٹا کے غاروں کی تاریک گھرائیاں جھانک رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے ان گنت صدیوں کے دبیز دھندلوں کے پیچھے سے دیکھ رہا ہے۔ وقت کا چکر ایک بار رک کر پیچھے کو چلتا شروع ہو گیا تھا۔ ان جانے پھرے دکھائی دے رہے تھے۔ ان سنی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان چھوٹے جسم مَس ہو رہے تھے۔ ان کھلی باتیں یاد آرہی تھیں۔ مجھ پر جیسے کسی نے جادو کر دیا تھا۔ میں بے حس ہو کر کھڑا تھا۔ لڑکی نے ہلکی جھکا لیں۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی ہتھیلی میں پسینہ آیا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں ٹرام میں بیٹھا تمہیں دیکھا کرتا تھا۔ تم بھی مجھے دیکھا کرتی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ہم نے اس سے پہلے بھی ایک دوسرے کو کبھی دیکھا ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی ایک دوسرے سے کبھی ملے ہیں اچھا بناؤ تمہارا نام کیا ہے۔"

لڑکی نے آہستہ سے آنکھیں اٹھائیں اور پراسرار آواز میں آہستہ سے بولی:

"ایلورا۔"

کس قدر مقدس اور قدیم نام تھا اس کا! اس نام میں ہزار سالوں کی تاریخ دفن تھی۔ ان گنت صدیوں کی گرداڑ رہی تھی۔ پرانے مندروں کے کھنڈرات میں اُگے ہوئے جنگلی پھولوں کی پرانی مک تھی۔ ایلورا۔۔۔۔۔ ایلورا۔۔۔۔۔ اس نام میں مندروں کی گھنٹیوں کی صدا تھی۔ میں نے پوچھا۔

"ایلورا!۔۔۔۔۔ ایلورا! مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے۔ مجھے تم سے ہمیشہ پریم ہوا ہے اور ہمیشہ پریم رہے گا۔ ایلورا! تم بڑی پراسرار لڑکی ہو تم کیا کرتی ہو؟"

اس نے ذرا مسکرا کر کہا:

"گھر میں ماں جی کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔ چڑیوں کو چاول ڈالتی ہوں۔"

وہ بڑی صاف ہندوستانی میں بات کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں جادو تھا اور لمبے میں

سنگیت رچا ہوا تھا میں نے کہا

"تم نے مجھے پہلی بار اس طرح کیوں دیکھا تھا؟ کیا تمہیں کچھ یاد آ گیا تھا؟"

ایلو را ایک دم سنبیدہ ہو گئی۔ اس نے گھور کر سورتی کی طرف دیکھا جو سامنے دیوار میں بنی ہوئی تھی ایک گھبراہٹ سے لیا اور نظریں جھکا لیں۔ میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اُس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اصرار کیا تو گھبراہٹ سے بولی۔

"میں جاتی ہوں ماں جی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

میں نے فوراً کہا:

"ایلو را پھر کب ملو گی؟"

"نہیں معلوم۔"

"ایسا نہ کہو ایلو را! میں اب تمہیں دیکھنے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر تمہارے درشن نہ ہوئے تو میں مرنے لگا۔"

"شی۔"

ایلو را نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اس انگلی میں سے حنا کی خوشبو آرہی تھی۔ میں تو اس کی اس بے ساختہ حرکت پر حیران رہ گیا۔

"ایسا نہیں کہا کرتے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر لیا۔ اُس نے آہستہ سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"میں چلی۔"

"کل آؤ گی۔"

"نہیں۔"

"پرسوں۔"

"نہیں۔"

"ایسا نہ کہو ایلو را! نہ کہو۔۔۔۔۔ میں تمہیں پھر بھی ملنا چاہتا ہوں۔ ضرور ملنا چاہتا ہوں۔ تمہارے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم کون ہو؟ تم پہلے کہاں تھیں؟ تم اس کے بعد کہاں ہو گی؟ ہم اس عظیم تپ کے بعد جدا ہو کر پھر کہاں ملیں گے؟ کب ملیں گے؟"

میں بولے جا رہا تھا اور ایلو را چپ چاپ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ سنواری چمکیلی آنکھیں کھلی تھیں۔ ہونٹ بند تھے۔ سانولارنگ بکھر کر

سرخ ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر پسینہ کی بوندیں جھللا رہی تھیں۔ کانوں میں پڑے ہوئے بندوق کے سبز پتھر ساکت تھے۔ جب میں خاموش ہو گیا تو اس نے بڑی محبت سے میرے ہونٹوں کے اوپر آیا ہوا پسینہ اپنی انگلی سے پونچھا اور آہستہ سے بولی:

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"امر کسر سے۔۔۔۔۔ پنجاب سے۔"

اس نے ایک لمبا سانس لیا۔

"پنجاب سے۔۔۔۔۔ ہندو نہیں ہو؟"

"مسلمان ہوں۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ وہ ایک دم غمگین ہو گئی۔ پھر ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔

مجھے بڑی ہی نرم اور محبت سے بھری ہوئی نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"لحد فی ہو کر رہتی ہے۔ تم کہاں؟ میں کہاں؟"

پھر آہ بھر کر بولی۔

"میں چلی۔"

میں اُس کی کوئی بات نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ تو گویا میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے یا کسی دوسرے سے مخاطب تھی۔ جب وہ جانے لگی تو میں اس کے سامنے آ گیا۔

"میں کل پھر یہاں آؤں گا۔"

میں یہاں اب نہیں آؤں گی۔

"کیا مجھ سے ناراض ہو گئی ہو ایلو را؟"

"نہیں۔"

"پھر کیوں نہیں آؤ گی۔"

"اس کا انجام ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"پریم انجام نہیں دیکھا کرتا ایلو را۔"

ایلو را نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اداس آواز میں بولی۔

"میں اگلے منگل وار کو آؤں گی۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنا کب ہاتھ چھوڑ دیا اور مندر کے ستونوں میں سے گزرتی تیز تیز

قدم اٹھاتی مندر کی سیر مہیوں کی طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کچھ دیر میں بالکل بت بنا وہاں کھڑا رہا۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھتا مندر کی سیر مہیوں کی طرف چل دیا۔ مندر سے باہر آیا تو دیکھا کہ بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ باہر آکر میں نے سگریٹ سلا گیا۔ اس کے دو تین کش لئے اور فٹ پاتھ پر پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑا۔ مجھ پر ایک پرسرار کیفیت طاری تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک ہزار برس پہلے کا آدمی ہوں اور تاریخ کے اوراق میں سے نکل کر کولمبو کی سرٹکوں آ گیا ہوں۔ جب ایلوار کا گھر آیا تو میں دوسرے فٹ پاتھ پر ہو گیا۔ اس کے گھر کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ دروازے کا پردہ ہوا میں ہل رہا تھا۔ برآمدہ ویران تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اب بوندا باندی نے ہلکی بارش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ سیرے کپڑے بھیگنے لگے تھے۔ میں نے رکشا لیا اور سیدھا گھر آ گیا۔

(4)

ساری رات بارش ہوتی رہی۔

سمندر کی طرف سے تیز رفتار برساتی ہواؤں کے جھکڑ چلتے رہے۔ ہوا ناریل کے درختوں میں چبھتی رہی۔ بارش کوٹھی کی ڈھلانی پھتوں پر دھڑا دھڑا برستی رہی۔ کھانا کھا کر میں بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تک پڑھتا رہا۔ بارش کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خواہ منواہ جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر کھڑکی کھول دوں اور بارش کا نظارہ کروں۔ یا اس بھری برسات میں باہر سرٹکوں پر نکل جاؤں اور دیوانہ وار گھومتا پھروں۔ میں نے سگریٹ بجھا کر کتاب پر سے پیمینی اور اٹھ کر لان کی طرف کھٹنے والی کھڑکی کھول دی۔ ہوا نے بارش کی بوچھاڑ اندر پھینک دی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ ہوا کے تھپیڑے سے سیز پر رکھا ہوا گلہسی کا گلدان فرش پر گر پڑا۔ مجھے نوند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ گھر مٹی دیکھی۔ ابھی صرف رات کے نو بجے تھے۔ میں نے برساتی پہنی اور کھرے پر تالا ڈال کر باہر آ گیا۔

سرک پر ٹرامیں اور بسیں گزر رہی تھیں۔ لوگ برساتیاں پہنے۔ پھتیریاں لگائے تیز تیز قدموں سے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ ہوٹلوں میں ریکارڈ لگے ہوئے تھے۔ بارش کے شور میں ریکارڈوں کے گانے کی آواز دب گئی تھی۔ سرخ پھولوں والے درختوں نے اپنی ٹہنیوں کو جھاڑ جھاڑ کر سرک پر سرخ پتہوں کا جال بچھا دیا تھا۔ یہ پتیاں چننے کے پانی میں بہہ کر سرک کے کنارے آ رہی تھیں۔ اوپر آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ناریل کے درختوں میں سے پانی کی آبرائیں سی نیچے فٹ پاتھ پر گر رہی تھیں۔ کولمبو کی بارش واقعی بڑی موسلا دھار تھی۔ عمارتوں کے فلیٹوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ روشندان کھلے تھے۔ لیکن سرک پر پردے کھینچے ہوئے تھے۔

میں بوریلہ چوک سے سلیو آئی لینڈ کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ بارش میں پیدل چلنے کا بھی اپنا ایک الگ مزہ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فٹ پاتھ پختہ ہو اور اوپر درخت جھکے ہوئے ہوں اور راستے میں لاہور کی سرٹکوں والے خوفناک مین ہول نہ ہوں۔

سلیو آئی لینڈ سے ہو کر میں سمندر کی طرف آ گیا۔ گال مینس ہوٹل کے ساتھ والی بیچ

پر میں لوہے کے جھنگے کا سارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ میری پیٹھ کو لمبو شہر کی طرف تھی اور منہ سمندر کی طرف تھا۔ رات کو سمندر کالا اور ہیبت ناک دکھائی دے رہا تھا اور تیز بارش میں سمندر کی سطح پر دھند اٹھ رہی تھی۔ زبردست لہریں بڑی تیزی سے اٹھ اٹھ کر ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ تیز ہوا میں میری برساتی کا دامن پھڑپھڑا رہا تھا۔ سمندر کی مرطوب ہوا میں مچھلیوں اور کھارے پانی کی بو تھی۔

کتنی ہی دیر میں وہاں کھڑا اپنے وطن کے گلی کوچوں اور مدراسی لڑکی ایلورا کے بارے میں سوچتا رہا۔ دونوں کی یاد ایک ایسی شدت سے میرے دل میں موجزن تھی۔ میں آدوا گوان کا اتنا زیادہ قائل نہیں ہوں مگر اس وقت مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں پہلے جنم میں یہاں ضرور پیدا ہوا ہوں اور ایلورا سے اس سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔ مجھ سے زیادہ اس بات کا ایلورا کو زیادہ یقین تھا۔ اگرچہ ابھی اس نے اس کا مجھ سے ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی باتوں اور میری طرف گہری گہری پر سرار نگاہوں سے دیکھنے کے انداز نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا۔

سمندر والے جھنگے سے ہٹ کر میں گال روڈ پر آگے کی طرف چل پڑا۔

گال مینس ہوٹل سے آگے گزر کر کوٹھیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کوٹھیوں کے عقب میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کوٹھیوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ بارش اب کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔ ہر تیسری کوٹھی کے بعد ایک ایک چھوٹی سی پتلی سرنگ بفل سے ہو کر دور نارمل کے جھنڈوں میں سے ہوتی ہوئی سمندر کی طرف نکل گئی تھی۔ ایسی پتلی دہلی سرنگوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بادل زور سے گرجا اور موسلا دھار بارش ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ موٹر کاروں اور بسوں کی تیر روشنیوں میں گرتی بارش کی لڑیاں جھللائے لگیں۔ بنگلوں کے صمنوں میں آگے ہوئے پیٹے اور کیلے کے درختوں کی ٹہنیاں ہوا کے سامنے جھک گئیں اور یوں موس ہونے لگا جیسے بارش کا خیر مقدم کر رہی ہوں۔ میں جنرل مرچنٹس کے ایک سٹور میں آ گیا۔ اس خیال سے کہ بارش سے بچ کر سگریٹ پی لوں گا۔ سٹور میں کچھ عورتیں اور مرد ضرورت کی چیزیں خرید رہے تھے۔ مجھے بھی سگریٹ کا ایک ٹین خریدنا پڑ گیا۔ ٹین خرید کر میں نے اسے کھولا۔ اور وہیں کاؤنٹر کے ساتھ لگ کر سگریٹ سلگایا۔ اچانک میری نظر روتھ پر پڑ گئی۔

وہ سامنے والے کاؤنٹر پر کھڑی بانس کی ٹوکری میں صابن کا ڈبہ اور چٹنی کی بوتل رکھ رہی تھی۔ میں چپکے سے اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو مسکرا کر بولی:

"رات کو بارش میں گھومنا بڑا اچھا ہوتا ہے۔"

میں نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

"لیکن لیکے کبھی نہیں۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ ہم سٹور سے باہر آ گئے۔

"تم میرے ساتھ گھر کیوں نہیں چلتے۔ گھر چل کر میں تمہیں فرنج کافی پلاؤں گی۔"

میں تو یہی چاہتا تھا۔ فوراً بولا۔

"میں بڑے شوق سے پیوں گا۔"

باہر روتھ کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر روتھ کے بنگلے میں آ گئے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ روتھ گال مینس روڈ پر ایک بنگلے کے کونے والے عقبی دو کمروں میں رہتی تھی۔ دونوں کمرے چھوٹے تھے لیکن اس نے خوب سہار کئے تھے۔ پہلا کمرہ قست گاہ کا کام دیتا تھا اور وہ دوسرے کمرے میں اس کی خواب گاہ تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر کمرے میں بتی جلائی۔ مجھے بیٹھک میں بٹھلایا اور خود اتنا کمرہ کر خواب گاہ میں چلی گئی۔

"میں ذرا کپڑے بدل آؤں۔"

بیٹھک میں دیواروں پر امریکی ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں لگی تھیں اور کونے والے میز پر ایک ننھی جشن کا لکڑی کا مجسمہ کھڑا تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے بارش کے شور کے ساتھ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔ میں میز پر سے رسالے اٹھا کر دیکھنے لگا۔ میں نے برساتی اتار کر کھونٹی سے ٹکا دی تھی۔ میرے کپڑے تھوڑے تھوڑے بھیگے ہوئے تھے۔ لیکن پینچے کی تیز ہوا میں فوراً سوکھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد روتھ نمودار ہوئی۔

اس نے شب خوابی کا باریک ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ جس میں اس کے بھرے بھرے جسم کے گول خطوط صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے بجلی کی کیتلی میں پانی ڈال کر بٹن دبایا اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگی۔

"آج تو بارش نے دھوم مچا رکھی ہے۔ کو لمبو میں برسات شروع ہو گئی ہے۔ اب یہ سلسلہ کئی مہینوں چلے گا۔"

میں نے روتھ کے سینے کے نیم عریاں اہبار پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں اکیلی رہتی ہو روتھ؟"

روتھ نے حیرانی سے کہا۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

"حرج تو کوئی نہیں میں بھی اکیلا ہی رہتا ہوں۔ لیکن یہ دور لکیلے رہنے کا نہیں۔ انسان

کو کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور تلاش کر لینا چاہیئے۔"

روتھ نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"میرا تجربہ یہ بھتا ہے کہ ساتھی ہمیشہ تکلیف اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ میں اکیلی

ہوں جس وقت چاہے آؤں۔ جس وقت چاہے نکل جاؤں۔ کوئی اعتراض کرنے والا نہیں

لیکن اگر میرا کوئی ساتھی از قسم خاوند یہاں رہتا ہو تو میں اتنی آزادی سے کبھی نہیں گھوم پھر

سکتی۔ وہ تو اپنی پابندیوں سے میرے ناک میں دم کر دے گا۔ کیا تم شادی کے حق میں ہو

وصی؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"شادی کو میں انسانی سماج کی سب سے بڑی بد نصیبی سمجھتا ہوں۔ اس حادثے نے

رو نما ہو کر انسانی زندگی کو ٹی کی کامیونز، بنا کر بستر پر ڈال دیا ہے۔ مگر میں اس کے ساتھ ہی

یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ کوئی مرد عورت کے بغیر اور کوئی عورت مرد کے بغیر مکمل نہیں

کھلوا سکتی۔ ان دونوں کا ملاپ ناگزیر ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن یہ ملاپ روستا نہ اور کبھی کبھی ہونا چاہیئے۔ نہ اس طرح کہ ایک مرد

عورت کی گردن پر ایک عورت مرد کے سر پر سوار کر دی جائے۔ اس طرح تو یہ نہ صرف یہ

کہ دونوں جنسوں کی تذلیل ہوتی ہے۔ بلکہ اچھی بھلی زندگی جہنم بن کر رہ جاتی ہے۔ میں اسی

لئے اپنے خاوند سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ ایک تو ہمارے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن روتھ! تمہارے ہاں تو لڑکی لڑکا کورٹ شپ کے ذریعے ایک دوسرے کے

مزاجوں کو پوری طرح پرکھ لیتے ہیں۔ تم لوگوں کو کم از کم یہ شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔"

روتھ ہنس پڑی اور ایش ٹرے میں سگریٹ جھاڑ کر بولی۔

"بات اصل میں یوں ہے کہ ایک مزاج شادی سے پہلے کا ہوتا ہے اور ایک شادی کے

بعد کا ہوتا ہے۔ یہ دونوں مزاج ایک دوسرے کا بعید کبھی نہیں کھولتے۔ جب تک کہ شادی

نہیں ہو جاتی۔ میں نے جس شخص سے شادی کی تھی۔ میں اُسے پانچ سال سے جانتی تھی۔ اس

نے ان پانچ سالوں کے دوران میں کبھی مجھ سے بدسلوکی نہیں کی تھی۔ کبھی بُری طرح پیش

نہیں آیا تھا۔ لیکن شادی کے بعد آہستہ آہستہ اس کی کایا پلٹنی شروع ہو گئی۔ شادی کی

دھوپ میں جوں جوں تالاب کا پانی سوکھتا گیا ہے سے گنگر پتھر روڑے اینٹیں اور چیتھڑے

نظر آتا شروع ہو گئے۔ وہی شخص جس نے کبھی مجھ سے غصے میں بات نہیں کی تھی۔ اب

میری صورت سے بیزار ہو گیا اور بات بات پر مجھے جھڑکنے لگا۔ ایک بار تو اس نے مجھے پیٹ

بھی ڈالا۔ بس پھر کیا تھا میں نے اس سے طلاق لے لی۔ میرا تو یہ ایمان ہے کہ ایک مرد سے

دس سال تک بغیر شادی کے ملتی رہیں تو اس کے رویے میں ذرا فرق نہیں آئے گا۔ وہ ہمارا

بدستور گرویدہ رہے گا۔ مگر جو نئی شادی کریں گی تو دوسرے ہی برس اس میں فرق آجائے گا

اور وہ ہمیں گھر میں چھوڑ کر دوسری عورتوں کے پیچھے جاگنا شروع کر دے گا۔ میں نے تو

اب شادی پر کان پکڑ لیتے ہیں۔"

"تو کیا تم باقی عمر اسی طرح گزار دو گی۔"

روتھ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

"خاوند کی بجائے میں دوستوں میں زیادہ خوش رہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے

بدن کو نگاہ کے اس پر کارپوریشن کے بکروں کی طرح صرف ایک آدمی کی مہر لگا دی جائے

اور اس آدمی کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ چاہے تو اس جسم کو گھر کے نعمت خانے میں سجا کر

رکھ دے اور چاہے تو اس جسم کو آگ پر بھون کر کھا جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

باہر بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ کھلی کھڑکی میں سے سمندر کی تیز ہوا اور لہروں کا شور

صاف سنائی دے رہا تھا۔ میں نے روتھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تم ایسے خوبصورت جسم کی صحت مند عورت کو ایک آدمی کے حوالے کر دینا

پوری انسانیت کی توہین ہے۔"

روتھ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اس کے دلکش قہقہے کی آواز بارش کے شور میں مجھے صاف

صاف اور آگ تنگ سنائی دی۔ کافی کی ایک پیالی پینے کے بعد روتھ نے سگریٹ سلا کر کہا۔

"آج میرا کھانا ایک سہیلی کے ہاں تھا۔ میں وہیں سے واپس آرہی تھی کہ تم مل گئے۔ کھانا کھاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔۔۔۔۔ میں گھر سے کھانا کھا کر نکلا تھا۔"

روتھ نے میری طرف جھک کر کہا۔

"پنکھا بند کر دوں۔ بارش کی وجہ سے کچھ خشکی ہو گئی ہے۔"

واقعی کمرے میں ہلکی ہلکی ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ بارش اور ٹھنڈی تیز ہوانے گرمی کو بٹکا دیا تھا۔ روتھ نے اٹھ کر پنکھا بند کر دیا اور الماری میں سے اطالوی وائین کی بوتل اور دو گلاس نکال کر میز پر رکھ دیئے۔

"میرا خیال ہے تمہیں ڈاکٹروں نے منع نہیں کیا۔ کیوں؟"

میں ہنس پڑا۔

"مجھے ڈاکٹر نے کسی بھی چیز سے منع نہیں کیا روتھ۔"

"یہ بری اچھی بات ہے۔"

ہم دونوں اطالوی وائین پینے اور باتیں کرنے لگے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہم دونوں شراب کے سرور میں تھے۔ بارش اسی طرح تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہو رہی تھی۔ روتھ کا چہرہ سرخ ہو کر دک رہا تھا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے ہونٹ جل رہے تھے۔ آنکھوں میں سرخ سرخ دھڑے سلگنے لگے تھے۔ وہ صوفے پر ایک طرف کچھ اس طرح سے جھکی ہوئی تھی کہ مجھے اس کے سینے کا ایک حصہ بالکل نگاہ دکھائی دے رہا تھا۔ اسکے ایک ہاتھ میں سگریٹ تھا اور دوسرے ہاتھ میں وائین کا نصف پیا ہوا گلاس۔ اس کے سنہری بال کھڑکی میں سے اندر آتی ہوئی سمندر کی ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کچھ وقت اور گزر گیا۔ روتھ کو نشہ چڑھ گیا۔ وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ جلاتی اور پیا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں بجانے کی بجائے کھڑکی میں سے باہر جھاڑیوں میں پھینک دیتی جہاں بارش نے طوفان مچا رکھا تھا۔ وہ ہمارے ریڈیو کے باس کے خلاف باتیں کرنے لگی۔

"بڑا ڈرنی آدمی ہے۔ دفتر میں ہی مجھے گود میں پھنسا کر میرا منہ چومتا ہے اور میری ٹانگیں سللاتا ہے۔ مجھے یہ باتیں پسند ہیں لیکن ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور پھر اس کے

منہ سے جھلے ہوئے پیاز کی بدبو آتی ہے۔ میں تو ایسے آدمی کو ایک پل کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک پل کے لئے بھی نہیں مسٹرو صی۔۔۔۔۔ اب تم ہو۔ میں نے اس روز تمہارا منہ چھتا تو مجھے سگریٹ کی خوشبو آتی تھی۔ اور تم نے اس رات میرے گھر کے اندر آنے پر ذرا بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ یہ بات مجھے بری پسند آتی تھی۔ اگر تم زبردستی اندر گھس آتے تو پھر تم میں اور خاوند میں کیا فرق رہ جاتا۔ پھر شادی ہی کیوں نہ کر لوں؟ تمہیں پتہ ہے کہ ایک روز ہمارا پاس زبردستی میرے گھر میں شراب پی کر آ گیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ بدسلوکی کی۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔ نوکر جو ہوئی۔ اتنے پیسے مجھے یہاں کسی پرائیویٹ فرم میں نہیں مل سکتے جتنے ریڈیو سیلون سے مل رہے ہیں۔ لیکن میں جانور نہیں ہوں۔ کیا میں جانور ہوں مسٹرو صی؟"

مجھے بھی نشہ ہو گیا تھا۔ ہم نے نصف بوتل سے زیادہ وائین پی لی تھی۔ میں نے سگریٹ راکہ دان میں دبا یا تو راکھ ان الٹ گیا۔

"اوہ! آئی ایم سوساری۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ بابا بابا۔۔۔۔۔ تم نشے میں ہو صی۔۔۔۔۔ بابا بابا۔"

میں نے جلدی سے حواس جمع کرتے ہوئے کہا۔

"نشہ تو مجھے تمہیں دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔ ادھر سے یہ اطالوی وائین بری تیز ہے۔ پھر تم میرے سامنے ہی نہیں بیٹھی ہو بلکہ مجھے خود پلا رہی ہو۔ اس اعتبار سے تو مجھے دو بوتل کا نشہ ہونا چاہیئے۔"

روتھ! اس مشرقی خیال سے بری منظور ہوئی اور خوب ہنسی۔ پھر اٹھ کر ہاتھ شب خوابی کے گاؤں کی جیبوں میں ٹھسا کر کمرے میں ٹیلنے لگی۔ تیز ہوا میں اس کا ریشمی گاؤں اس کے جسم سے لپٹ کر اس کے گول اور گداز خطوط کو زیادہ نمایاں کرنے لگا۔ میرے بدن میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد روتھ اپنے پہلے خاوند کی سنگ دلی کے قے سنا رہی تھی۔

"وہ سنت سردی میں مجھے نگاہ کر کے کہا کرتا تھا کہ جا کر فرش دھوؤ۔ ایک روز کم بخت نے بارش میں مجھے گھر سے نکال دیا۔ وہ خود بھی جانور تھا اور مجھے بھی جانور سمجھ رہا تھا۔ ایک روز اُس نے اس بری طرح سے مجھے پٹا کہ میں نے جا کر تھانے میں رہٹ لکھوادی۔ یہ دیکھو۔

اس کی مار کے نشان ابھی تک میرے جسم پر ہیں۔"

اتنا کہہ کر اس نے کندھے پر سے کپڑا ہٹایا اور شانے پر مجھے زخم کا نشان دکھانے لگی۔ زخم کا نشان نظر آنے سے پہلے مجھے اس کے سینے کا ایک پورا حصہ تنکا نظر آ گیا۔ میری آنکھوں میں رنگ برنگے ستارے ٹوٹنے لگے۔ اس نے بھی میری نظروں کی چوری پکڑ لی تھی۔ جلدی سے کندھے پر کپڑا درست کر کے مسکرائی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"ہر مرد میں تھوڑا بہت جانور ضرور ہوتا ہے۔ اس وقت میں نئے میں ہوں۔ میرے منہ سے سچی باتیں نکلیں گی۔ برا نہیں ماننا۔ ویسے تم مجھے پسند ہو۔ آج رات بارش کی رات ہے۔ کولمبو میں بارش کی راتیں بڑی گرم ہوتی ہیں۔ ان بارش میں بھیگی ہوئی گرم راتوں میں بڑے بڑے پتھر دل پگھل جاتے ہیں۔ کیا تم جانتے ہو عورت کی حقیقت کیا ہے؟ نہیں تم ابھی اس راز کو جاننے کے لئے بڑے چھوٹے ہو۔ ابھی تمہیں ایک عمر اس تجربے کو حاصل کرنے کے لئے چاہیئے۔"

روتھ نے میرے قریب آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم دونوں کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ روتھ نے بتی گل کر دی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا گرتی بارش کے شور میں سمندر کی لہروں کا شور مدغم ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر بیٹھا ہوا اندھیرا پڑھنے پر گیلے کھمبل کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ روتھ نے اپنا بازو میری کمر کے گرد محافل کر دیا۔ اور اپنا خوبصورت سر میرے کندھے سے گا دیا۔ ہم دونوں جھول رہے تھے۔ روتھ کے گداز صحت مند جسم کی گرمی میرے تشنہ اور دیکتے ہونے بدن میں حلول کر رہی تھی۔ میری آنکھیں سلگ رہی تھیں اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے پانی پیا۔ روتھ جھومتی ہوئی خواب گاہ میں چلی گئی۔

اس نے اندر جا کر بڑی محبت سے مجھے آواز دی۔ میں اندر گیا اس نے خواب گاہ کی کھڑکی کا پردہ ہن دیا تھا اور کھڑکی کی سل پر بیٹھی سگریٹ پتی رہی تھی۔ اس کا کاؤن ٹانگوں پر سے کھسک گیا تھا اور وہ نیم عریاں حالت میں تھی۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

روتھ نے اندھیرے میں چمکتی ہوئی نشیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور سل سے اتر کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا سگریٹ کھڑکی سے باہر گر پڑا۔ وہ میرے بازوؤں میں سما گئی تھی اور اس نے اپنا پورا بوجھ مجھ پر گرا دیا تھا۔ میں اسے اٹھا کر پلنگ پر لے آیا۔ پلنگ پر لٹا

کر میں نے اس کا سر سرہانے پر رکھا اور چادر اس کے اوپر کر دی۔ جب میں آہستہ سے اس کا منہ چوم کر پیچھے ہٹنے لگا تو روتھ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اپنے دونوں بازو میری گردن میں ڈال دیئے۔

"بارش ہو رہی ہے ناں؟"

"ہاں۔"

"سمندروں کا شور سنائی دے رہا ہے ناں؟"

"ہاں۔"

"ٹائریل کے جنگل پانی میں بھیگ گئے ہیں کیا؟"

"ہاں روتھ۔ بارش نے جل تھل ایک کر دیا ہے۔"

"پھر تم اس وقت کہاں جاؤ گے؟"

"اپنے گھر۔"

"بڑے نادان ہو۔ کیا یہ گھر تمہارا نہیں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے کسی دوست کی

ضرورت نہیں؟ آج کی رات تم یہیں سو جاؤ۔ اس بارش میں کہاں جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن روتھ۔۔۔۔۔"

روتھ نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

"تمہیں زندگی کے تجربات حاصل کرنے ہیں۔ تمہیں ایسی کئی بارش والی راتیں گھر سے باہر گزارنی پڑیں گی۔ کیا تم ہر ڈروانی رات میں اپنے گھر کو یاد کر کے اداس ہو جاؤ گے؟ نہیں میرے پیارے! تم ایسا نہیں کرو گے۔ زندگی بار بار اپنی سنہری کھڑکی نہیں کھولا کرتی۔"

اس کے ساتھ ہی روتھ نے مجھے اپنے ساتھ لٹا لیا۔ اس نے چادر اور اپنا کاؤن پر سے پھینک دیا۔ کمرے کے نیم اگلے میں مجھے اس کے سرخ و سپید عظیم الشان جسم کے سارے خطوط عریاں نظر آرہے تھے۔ اس کے سینے کا ابھار دھڑکن رہا تھا۔ کچھ کہہ رہا تھا۔ کچھ سن رہا تھا۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہاں صرف بارش کی آواز تھی۔ سمندر کی طرف سے آنے والا لہروں کا شور تھا۔ روتھ کے جسم کی پکار تھی۔ میرے انگ انگ کی دھڑکنیں

نہیں۔ اس کے دہکتے ہوئے ہونٹوں کا شیریں رس تھا اور میرے خشک ہونٹوں کا پھیلا ہوا
تشنہ دامن تھا۔ خوشبو تھی۔ گرم خوشبو سے مہکا ہوا گھنا جنگل تھا۔ وہاں نہ روتہ تھی۔ نہ میں ہی
تھا۔ رات تھی۔ بارش تھی۔ سمندر کی کٹ اڑائیں غضبناک لہریں تھیں۔ آگ و خون کے
جہنم میں جلتے ہوئے پھول تھے۔ خون آلودہ چاک دالان کلیاں تھیں۔ کانٹے تھے۔ خاردار
جھاڑیوں پر گری ہوئی گرم شبہنم تھی اور کچھ نہیں تھا۔ روتہ نے میرے کانوں پر اپنے ہونٹ
رکھ کر ہلکی سی آہ بھری اور اپنا سر میرے بازوؤں میں چھپا دیا۔ میرا چہرہ روتہ کے خوشبو
اڑاتے سنہری اور ریشم کی طرح لالہ بالوں میں گم ہو گیا اور پھر بارش تیز اور تیز ہو گئی اور
کھڑکی کے پٹ بننے لگے۔ پردہ دیوانوں کی طرح لہرانے لگا اور نادرمل کے درختوں کی پکلیلی
ٹہنیاں طوفان میں دُہری ہو گئیں اور سمندر کا شور و حشتناک ہو گیا۔

5

یوں تو ریڈیو سیلون کے عملے کا ہر آدمی مس روتہ سے عشق کرتا تھا۔
لیکن صوبیدار پیارا تو اس پر بری طرح لٹو ہو گیا تھا۔ وہ کھتا تھا کہ روتہ کو دیکھ کر مجھے
اپنی بیوی ہربنس کو یاد آ جاتی ہے۔ میں نے صوبیدار پیارا سنگھ کو کہا۔
"مگر صوبیدار روتہ کا رنگ تو بے حد گورا اور سرخ ہے اور بال بھی سنہری ہیں۔ جہاں
نیک مجھے معلوم ہے۔ پنجاب کی عورتوں میں یہ تین چیزیں شاذ ہی اکٹھی ملتی ہیں۔"
پیارا سنگھ روتہ کی طرح خرخر کر بولا۔

"بال اور رنگ نکال دیں اور سامنے ہو۔ ہر ہربنس کو کھڑی ہے۔ میرا بس چلے تو میں
اسے اٹھا کر لے جاؤں۔"

"مگر کہاں لے جاؤ گے؟ ہربنس کو کور کے پاس جس کی اس سے شکل ملتی ہے۔"
پیارا سنگھ ہنسنے لگا۔

"اجی گھر کون کافر لے جائے گا۔ اس کا تو میں اسی شہر میں ایک سال تک بھوجن کر
سکتا ہوں۔"

تو معلوم ہوا کہ پیارا سنگھ دراصل بیوی کو نہیں روتہ کو پیار کرتا ہے اور بیوی کا محض
ایک ہمانہ ہی ہے۔ ہو سکتا ہے روتہ کی تصویر بہت شکل ہربنس کو سے ملتی ہو۔ لیکن
حقیقت میں پیارا سنگھ روتہ کا بھوجن کرنا چاہتا ہے۔ پیارا سنگھ اونچا لمبا جوان سکھ تھا۔ چہرہ
گول اور بالوں میں چھپے ہوئے سفید دانت، سرخ سرخ اندر کو دھنستی ہوئی آنکھیں۔۔۔۔۔
فوجی گیریزن میں دوسرے فوجیوں کے ساتھ ایک بارک میں رہتا تھا جس کی چھت پھونس کی
تھی۔ روز رات کو شراب پیتا۔ کچھا اور بنیان پہن کر بھالو ایسے جسم پر بالوں کا گھنا جنگل
پھیلائے شراب پی کر میرٹھ کے حوالدار قریشی کے پلنگ کے ارد گرد جھومتا چکر لگاتا اور
پھر بال کھول کر زمین پر بیٹھ جاتا اور اپنی بیوی ہربنس کو روتہ کو آوازیں دیتی شردع کر دیتا۔
ساتویں پیگ پر اسے بیوی بھول جاتی اور مس روتہ کی یاد میں اونچی اونچی آہیں بھرنی شردع کر
دیتا۔ آدمی بوتل پینے کے بعد وہ شے میں دھت ہو جاتا اور قریشی کے پاس جا کر کھتا۔

رکھے ٹائپ کر رہی تھی کہ پیارا سنگھ نے اسے باہر بلایا اور شام کو کھانے کی دعوت دے دی۔
 روتھ مسکرا دی اور یہ سوچ کر کہ اس کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔ اس کی دعوت قبول
 کر لی۔ پیارا سنگھ تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ سارا دن وہ اس خیال سے ناچتا رہا کہ شام کو روتھ
 اس کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھائے گی۔ اس نے دفتر میں چپڑاسی تک کو بتا دیا کہ آج وہ
 دفتر سے جلدی چلا جائے گا۔

"کیونکہ روتھ کی اس نے دعوت کر رکھی ہے۔"

شام کو وہ پورے فوجی لباس میں روتھ کو لے کر ایک ہوٹل میں آ گیا۔ یہ ساری باتیں
 مجھے بعد میں معلوم ہوئیں۔ روتھ محض پیارا سنگھ کا دل رکھنے کے لئے اس کے ساتھ ہو گئی تھی۔
 ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد دونوں گال روڈ پر سمندر کے کنارے سیر کرتے رہے۔ پیارا
 سنگھ کی تو گویا عید ہو گئی تھی۔ وہ روتھ کے کندھے سے کندھا ملائے چل رہا تھا۔ اور اس کے
 گدرائے ہوئے سینے کے اہبار کو ہوس ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ہر ہنس کور بھول
 گئی تھی۔ اب تو صرف روتھ اس کے سامنے تھی اس کے ساتھ تھی اور کسی جتن سے اس کا
 بھوجن کرنا چاہتا تھا۔ اس نے روتھ کے ڈر کے مارے شراب نہیں پی تھی۔ ایک تو اس لئے
 کہ کہیں روتھ اس کا برانہ مانے دوسرے اس خیال سے بھی شراب پی کر وہ عام طور پر آپے
 سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔ اسے ڈرتا کہیں وہ نشے میں روتھ کی بے عزتی نہ کر بیٹھے۔ روتھ نے
 پیارا سنگھ کا دل مزید خوش کرنے کے لئے کہا۔

"آؤ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔ دیکھو گے؟"

پیارا سنگھ خوش ہو کر بولا۔

"کیوں نہیں سمجھو۔۔۔۔۔ ہم کو تو تم وہیں رکھ لو؟"

روتھ ہنس پڑی وہ اسے ساتھ لے کر اپنے گھر آ گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے عادت کے
 مطابق وائن پیئنی شروع کر دی۔ صوبیدار پیارا سنگھ کو دعوت دی تو اس نے وسکی مانگی۔ روتھ
 نے وسکی کی بوتل میز پر رکھ دی۔ اب دونوں شراب پینے لگے۔ صوبیدار پیارا سنگھ دیکھتے ہی
 دیکھتے آدمی بوتل اور پھر پونی بوتل پی گیا۔ وہ ماجھے کا جٹ تھا۔ شراب کو پانی سمجھ کر پینے کا
 عادی تھا۔ روتھ ذرا انگریزی فیشن سے پی رہی تھی۔ اور پیارا سنگھ گلاس بھر بھر کر خالی کر رہا تھا۔
 نتیجہ یہ ہوا کہ روتھ پر ابھی سرور کا عالم تھا کہ صوبیدار پیارا سنگھ نشے میں دھت ہو گیا۔ اس کا

"سارے میرٹھ کے کوٹے! تیری اردو میں ایک منٹ میں ساری کی ساری نکال سکتا
 ہوں۔ تو چھٹی پر میرٹھ گیا اور میرے لئے قینچی نہیں لایا۔ ہنسی یاوے میرٹھ میں سوائے
 استرے قینچیوں کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ قینچی نہیں لایا اور گٹر کرتی اردو لے آیا۔ ابھی ایک
 ایسا گھونسا دوں گا کہ اردو کے ساتھ سارے دانت باہر آجائیں گے۔۔۔۔۔"

حوالدار بے چارہ چپکے سے ایک طرف ہو کر پڑا رہتا۔ اس نے کبھی میزروں سے
 شکایت نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ پیارا سنگھ سے ڈرتا تھا اور پھر پیارا سنگھ بھی صرف شراب میں
 اس کی اردو کی مخالفت کرتا تھا۔ اسے صرف اردو بولنے والوں سے بیر تھا۔ کیونکہ وہ کہا کرتا۔

"یہ لوگ مر جیں بہت کھاتے ہیں اور جھوٹ بہت بولتے ہیں۔ بیوفا تو ہوتے ہیں اور
 اپنے دوست کو ضرور دھوکا دیتے ہیں۔"

میں نے اسے کئی بار سبجایا کہ ہر اردو بولنے والا ایسا نہیں ہوتا اور پھر اس قسم کی
 برائیاں تو ہر قوم کے افراد میں پائی جاتی ہیں۔ مگر صوبیدار پیارا سنگھ کی موٹی عقل میں یہ بات
 بالکل نہیں آتی تھی۔ زیادہ شراب پی کر وہ روتھ کو یاد کر کے اپنا جوڑا کھول دیتا اور رونا شروع
 کر دیتا۔ وہ روتھ روتھ کر کے اسے پکارتا اور بار بار سیری جان روتھ میری مشوق روتھ کہہ کر
 حوالدار قریشی سے لپٹ لپٹ جایا کرتا۔ اس بیرک میں فوجیوں نے صوبیدار پیارا سنگھ کا اچھا
 خاصا مذاق بنا رکھا تھا۔ صبح جب وہ دفتر آتا تو روتھ کو دیکھ کر شرما جایا کرتا اور اس سے کبھی
 آنکھ نہ ملاتا۔ روتھ کو علم تھا کہ صوبیدار پیارا سنگھ اس کا عاشق ہے۔ وہ اس خیال سے بڑی
 خوش ہوا کرتی اور کبھی کبھی محض مزہ لینے کے لئے اور اپنی خود پسندی کو تکلیف دینے کی خاطر
 اس کی حوصلہ افزائی بھی کر دیا کرتی تھی۔ وہ سب کے سامنے اس سے مسکرا کر بات کر لیا کرتی
 اور کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیتی۔

"اب کے اگر میں نے شادی کی تو پیارا سنگھ سے کروں گی۔"

پیارا سنگھ کا چہرہ خوشی سے مسکرانے لگتا۔ وہ ان باتوں کو سچ سمجھے ہوئے تھا۔ اس کی
 خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہتا۔ جب دفتر والے اسے سمجھاتے کہ روتھ اس سے مذاق کر رہی
 ہے تو اسے یقین ہی نہ آتا۔ وہ کہتا۔ تم سب جلتے ہو۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں تم
 سب سے طاقت ور ہوں۔ روتھ دراصل غلطی کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آگ سے
 کھیل رہی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ روتھ دفتر میں بیٹھی کچھ کاغذات سامنے

ہمارا ایسا سرگردن پردائیں بائیں گھونسنے لگا اور بھالو ایسا بدن جمونے لگا۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ اور وہ بار بار روتے کے سینے کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ روتہ کو کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"اب چلتا چاہیئے مسرپیارا سنگھ۔"

لیکن مسرپیارا سنگھ ماجھے کا جٹ بن گیا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔

"آپاں تو ایسے ہی رہوں گا۔"

روتہ سمجھ گئی کہ معاملہ خراب ہو گیا ہے۔ اب اس رنجھ سے بچنا مشکل ہے۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ اپنی عصمت کو بچانے کی خاطر کھڑکی سے چھلانگ لگا دیتی۔ پھر بھی وہ ایک اچھے ذوق کی مالک تھی۔ اسے یہ بات کبھی پسند نہیں تھی کہ کوئی اس کے ساتھ زبردستی کرے۔ جب اس نے دیکھا کہ صوبیدار پیارا سنگھ کسی طرح وہاں سے ہلتا ہی نہیں تو اس نے کہا۔

"اچھا تم یہاں آرام کرو۔ میں ذرا باہر ٹہل آؤں۔"

اتنا کہہ کر وہ باہر نکلے لگی تو صوبیدار پیارا سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہاتھی کی طرح کھڑے کھڑے جھول رہا تھا۔ اس نے روتہ کو کھائی سے پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچ کر بولا۔

"ہم کو اکیلا چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو ہرنس کور تم میری بیوی ہو۔ آج اتنی دیر بعد ملی ہو۔ مجھے بھوجن تو کر لینے دو۔"

روتہ نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر پیارا سنگھ کی مضبوط گرفت سے کھائی چھڑانا آسان کام نہیں تھا۔ پیارا سنگھ نے دروازے کی پٹھنی لگا دی۔ روتہ نے سوچا کہ وہ شور مچا دے۔ پھر خیال آیا ایسا کرنے سے وہ محلے میں بدنام ہو جائے گی۔ پھر دفتر والوں کو معلوم ہے کہ روتہ نے اس کی دعوت خود قبول کی تھی۔ اس کے علاوہ اسے پیارا سنگھ کی فولادی گرفت میں ایک طرح کی لذت کا احساس بھی ہوا تھا۔ اس کے باوجود روتہ نے ہاتھ پاؤں مارے اور اپنے آپ کو پیارا سنگھ کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ مگر پیارا سنگھ شرابی ہو رہا تھا اور روتہ اس کے سامنے تھی۔ وہ مر سکتا تھا۔ مگر روتہ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے روتہ کو اپنے سینے سے چٹا لیا اور بے درپے اس کا منہ جوسنے لگا۔ روتہ نے اپنا سانس روک لیا۔ لیکن کب تک؟ پیارا سنگھ اسے کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا اور

پلنگ پر گرادیا۔ روتہ نے غصے میں کہا۔

"میں تمہیں صبح کو ارڈر گاڑ میں بند کرادوں گی۔ آخر تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ میں شور مچا دوں گی۔"

صوبیدار پیارا سنگھ نے جیب سے فٹ بھر لمبا چاقو نکال کر اس کی نوک روتہ کے سینے پر رکھ دی۔ روتہ کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ بے حس ہو کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ پیارا سنگھ نے چاقو میز پر رکھ دیا اور روتہ کا کاؤن کچھ اس طرح کھینچا کہ وہ پھٹ گیا۔

اس رات صوبیدار پیارا سنگھ نے کچھ اس طرح بھوجن کیا کہ روتہ بیمار ہو گئی۔ پیارا سنگھ بھی اس ہفتے چھٹی لے کر کانڈی چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ روتہ ضرور باس سے اس کی شکایت کر دے گی اور اسے کو ارڈر گاڑ میں بند کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ مگر روتہ نے ایسا نہ کیا۔ تین روز بیمار رہنے کے بعد وہ بھلی چنگی ہو کر دفتر آ گئی اور آتے ہی اس نے پیارا سنگھ کا پوچھا۔ ہفتے بعد پیارا سنگھ دفتر آیا تو اس کی آنکھیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔ روتہ نے اسے دیکھا اور اس کے قریب آ گئی۔ پیارا سنگھ کی روح خشک ہو گئی۔ روتہ نے قریب آ کر کہا۔

"صوبیدار میں نے تمہاری شکایت نہیں کی اس لئے کہ اب میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔"

پیارا سنگھ تو ہکا بکا رہ گیا۔

اس واقعے کے بعد روتہ پیارا سنگھ پر بہت مہربان ہو گئی اور ہفتے کی شام اسی کے ساتھ بسر کرتی۔ دونوں کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتے۔ وہاں سے روتہ اسے گال روڈ پر اپنے گھر لے جاتی۔ رات کو وہیں بھوجن ہوتا اور صبح سارا دن وہ سمندر کے کنارے سیریں کرتے پھرا کرتے۔ میجر حامد کو یہ بات سنت ناگوار محسوس ہوئی مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ روتہ کا ذاتی معاملہ تھا اور پھر وہ فوج کی باقاعدہ ملازمہ بھی نہیں تھی۔ صوبیدار پیارا سنگھ کے تو پاؤں بارہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنی ساری تنخواہ روتہ پر خرچ کر دیتا۔ وہ ہرنس کور اپنی بیوی کو بھول گیا تھا۔ اس کا خط آتا تو غصے میں اسے لکھتا۔ "بکواس بند کرو۔ تم مجھے آرام سے نوکری کرنے دو گی یا نہیں؟ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس واہگوراجی کی قح!"

مگل وار کی شام کو میں اپنی مہربان ایلورا سے ملنے شام کو مندر آ گیا۔

مندر میں پچھلے منگل وار کی طرح اچھی خاصی چمپل پہل تھی۔ بچاری اور بچار نہیں ہاتھوں میں کنول کے پھول اور کانسی کی تتالیوں میں لوبان لئے کٹاں کٹاں جلی آرہی تھی۔ میں نے اس روز بھی ہندووانہ لباس یعنی بنگالی دھوتی کرتا پہن رکھا تھا۔ اس خیال سے کہ کسی کو میرے غیر ہندو ہونے کا شک نہ ہو۔ ایلورا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں کچھ در مندر میں ہی ادھر ادھر ٹھٹھا رہا۔ پھر ایک جگہ ذرا پر سے ہٹ کر ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد مجھے ایلورا مندر میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ بالوں کے جوڑے میں کنول کا پھول سجا رکھا تھا۔ ہاتھ میں تتالی تھی۔ جس میں لوبان سلگ رہا تھا۔ وہ چپکے سے مندر کے اندر چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا پوجا کرنے کے بعد وہ باہر آ کر مجھے دیکھے گی۔ چنانچہ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ایلورا مندر کے دروازے سے باہر صحن میں آ گئی۔ اس نے دور ہی سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میرے قریب آ کر وہ رک گئی۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے نمستہ کیا۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا آج اس کے کانوں میں سرخ پتھروں والے بندے تھے اور ناک میں جو کیل پڑی تھی اس میں سبز پتھر چمک رہا تھا۔ ماتھے پر سرخ تنک لگا تھا اور گہرا سانا نولا چہرہ اسی طرح چمک رہا تھا۔

ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ صحن میں سے ہو کر ہم ایک تنگ سی سیرمھیاں چڑھ کر مندر کی چھت پر آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں قدرے اندھیرا تھا اور سرنگ کے کنارے اُگے ہوئے درخت کی شاخیں چھت کے مندر پر جھکی ہوئی تھیں۔ ایلورا نے کانسی کی تتالی زمین پر رکھ دی اور گھٹنے جوڑ کر اس طرح بیٹھ گئی کہ اپنی تیکھی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھ دی اور مجھے گہری گہری نگاہوں سے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

میں نے کہا۔

"میں نے ایک ہفتہ تمہاری یاد میں تڑپ تڑپ کر گزارا ہے ایلورا۔ میں گھڑیاں گن رہا تھا۔ میں کتنی بار تمہارے مکان کے سامنے سے بھی گزرا مگر تم ایک بار بھی دکھائی نہیں دیں۔ کیا تم باہر گئی ہوئی تھیں؟"

ایلورا نے اپنی بڑی سیاہ پلکیں جھپک کر سرگوشی ایسی آواز میں کہا۔

"میں اپنی ماسی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ کل آئی ہوں۔"

ایلورا نے آنکھیں جھکالیں اور ضرما کر ہونٹ دانتوں کے داب لئے۔ میں نے اس کا

نازک اور گرم ہاتھ تمام لیا؟"

"بتاؤ ایلورا! کیا تم بھی مجھے یاد کیا کرتی تھیں؟"

ایلورا نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلادیا۔

"ایسے نہیں ایلورا مجھے زبان سے بتاؤ۔"

ایلورا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی

"ہاں۔"

"کیا ہاں؟"

"میں بھی یاد کرتی تھی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"کے؟"

"تمہیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ضرما کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور میں نے دیکھا کہ اس کے جوڑے میں لگا ہوا کنول کا پھول میری طرف دیکھا کر مسکرا رہا تھا۔ مندر کی چھت پر ہلکی ہلکی روشنی میں وہ ایک بہت بڑا ستارہ معلوم ہو رہا تھا۔ جو دو محبت کرنے والوں پر جک کر اپنی روشنی پھیلا رہا ہو۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں لے کر ایلورا کا خوبصورت چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس وقت ایلورا مجھے گوتم بدھ کے زمانے کی کوئی دیو داسی معلوم ہو رہی تھی۔ گہری چمکیلی پراسرار آنکھیں، سیاہ بالوں میں لگا ہوا کنول کا سفید پھول، کانوں میں سرخ پتھر، ناک میں چمکتا ہوا سبز نگ اور گہرے سانولے سلگتے ہوئے رخسار اور تیکھی ناک۔۔۔۔۔ ایلورا مسکرا رہی تھی۔ اور میں تاریک راتوں کے جنگل میں تنہا کھڑا ہوں اور اپنشد کے عہد کی کوئی زمینی بانس کے درختوں میں سے جھانک کر مجھے دیکھ رہی ہے اور اپنے پاس بلارہی ہے۔ میں نے کہا۔

"ایلورا! میں نے اس سے پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے۔"

ایلورا ذرا سا مسکرا کر خواب ایسی آواز میں بولی۔

"میں نے بھی تمہیں دیکھا ہے۔"

"لیکن کہاں؟ میں نہیں جانتا۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"پھر بتاؤ۔ خدا کے لئے جلدی بتاؤ۔"
ایلورا نے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ ٹھنڈی سانس بھری اور اٹھ کر
کھڑکی ہو گئی۔

"اب چلنا ہے۔"

"اتنی جلدی؟"

"ماتا جی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

"پھر کب ملاقات ہوگی ایلورا؟"

"اگلے مہینے کو۔"

"نہیں نہیں ایلورا! میں ہفتہ ہفتہ بھر تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کسی طرح مجھے پہلے
بھی ملو۔ کیا تم سمندر کے کنارے نہیں آ سکتیں؟"
ایلورا کی آنکھیں فرش پر تھیں اور کانسی کی تھالی اس نے سینے سے لگا رکھی تھی۔ بڑے
اداس لہجے میں بولی۔

"اس سے کیا حاصل ہوگا؟"

"میں نے بے تاب ہو کر کہا۔"

"پریم میں پریم کے درشن ہی سب کچھ ہوتے ہیں ایلورا مجھے تم سے مل کر شانتی ملتی
ہے۔ میری روح کو چین نصیب ہوتا ہے۔"

ایلورا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"لیکن میں بے چین ہو جاتی ہوں۔ میری روح کی شانتی مجھ سے چھن جاتی ہے۔ ایسا
کیوں ہوتا ہے؟ میں نہیں جانتی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں مجھ سے پریم نہیں ایلورا۔"

ایلورا نے میرا ہاتھ تمام لیا۔

"پریم سے بھی بڑھ کر میں تمہاری پوجا کرتی ہوں۔ میں نے ہر جنم میں تم سے پریم
کیا ہے۔ اور ہر جنم میں پریم کرتی رہوں گی۔ لیکن یہ خیال سستا ہے کہ ہر جنم کی طرح اس
جنم میں بھی تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گے۔ مجھے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلے جاؤ گے اور میں روتی
ہوئی اکیلی رہ جاؤں گی۔"

میں نے ایلورا کا ہاتھ چوم کر کہا۔
"میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا ایلورا۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔
میں تم سے شادی کر لوں گا۔"

ایلورا نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
"جنگوان کے لئے ایسا نہ کہو۔ دیوتا سن رہے ہوں گے۔ وہ ہم پر اپنا عذاب نازل کر
دیں گے۔ جو بات ہو نہیں سکتی اس کا ذکر ہی نہ کرو۔"
"کیوں نہیں ہو سکتی ایلورا؟"
ایلورا نے اداس لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ تم کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہو۔ میں دوسرے مذہب کی لڑکی
ہوں۔ ہمارا تمہارا ملاپ اس دنیا میں کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہم تو شروع ہی
سے جدا ہونے کے لئے ملتے رہے کیونکہ جنگوان کی یہی مرضی ہے۔"
میں نے ایلورا کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

"تم گوتم بدھ کی ماننے والی ہو اور گوتم بدھ کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ وہ دنیا میں
صرف محبت اور پریم کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اس نے ہمیشہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے رشتے
جوڑے ہیں۔ کیا وہ ہماری شادی سے ناراض ہو سکتا ہے؟"

"جنگوان بدھ ناراض نہیں ہوں گے۔ مگر مذہب کے پجاری ضرور ناراض ہو جائیں
گے۔ جنگوان بدھ مذہبی نہیں تھے لیکن ان کی باتیں مذہب بن گئی ہیں۔ میرا گھرانہ ہندو
بدھ مت گھرانہ ہے۔ تم مسلمان ہو۔ پھر ذرا سوچو ہمارا تمہارا ملاپ کیسے ہو سکتا ہے؟"
میں نے کہا۔

"کیا ہم دونوں اپنے اپنے مذہب کو چھوڑ نہیں سکتے ایلورا؟"

ایلورا نے ہلکی سی آہ بھری اور کہا۔

"یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں کسی نے ایسی رسیوں میں جکڑ دیا ہے
جو موت کے بعد بھی نہیں کھل سکتیں۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔"
"کیا کل سمندر پر آؤ گی؟"
"نہیں نہیں۔۔۔۔۔ میں نہیں آ سکتی۔"

"تمہیں کون روکتا ہے۔ تم جہاں چاہو جا سکتی ہو۔"
 "ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی نہیں روکتا۔ لیکن میں خود اپنے آپ کو روکتی ہوں۔ میں خود اپنے آپ سے ڈرتی ہوں۔"

"یہ تمہارا وہم اور نا سمجھی ہے ایلورا! ہم دو پریمی ہیں۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے پاس رہنا چاہیے۔ کیا خبر کب ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔"

"ایسا نہ کہو۔۔۔۔۔ ایسا نہ کہو۔ میں آؤں گی۔ تم سے ملنے ضرور آؤں گی۔ مگر کل نہیں۔ پرسوں آؤں گی۔"

"مہماں"

"تم دو بجے لاسٹ ٹاور کے پاس میرا انتظار کرنا۔"

"میں ٹاور کے پاس والی مارکیٹ کے دروازے پر کھڑا ہوں گا۔"

"اچھا۔"

میں نے آگے بڑھ کر اپنے ساتھ لگایا اور اس کا منہ چوم لیا۔ ایلورا کا گرم جسم کانپنے لگا۔ اس کے خشک انگارہ ایسے چلتے ہوئے ہونٹوں نے میرے جسم میں آگ لگادی۔ وہ جلدی سے بھاگ کر چھت کی سیرٹھیاں اتر گئی۔ میرے ہونٹوں پر ابھی تک ایلورا کے ہونٹوں کی آگ اور خوشبو تھی۔ میں کتنی ہی دیر بت بنا مندر کی چھت پر بیٹھا رہا۔ پھر چیپکے سے اٹھا اور نیچے اتر آیا۔

6

صبح دفتر آکر بیٹھا ہی تھا کہ گل زیب کا فون آگیا۔ اس نے فون پر مجھے بتایا کہ آج اس کی سالگرہ ہے اور مجھے اس میں شرکت کرنی ہوگی۔ میں نے کہا کہ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ گل زیب کی سالگرہ ہو اور میں اسے اپنی آنکھوں کے سامنے خوبصورت لباس میں چلتے پھرتے دیکھوں۔

"آپ بہت جلد رومائنک ہو جاتے ہیں۔ بہر حال شام کو ضرور آئیے گا۔ آپ کے نام دعوت نامہ پوسٹ کر دیا گیا ہے۔ آج مل جائے گا۔ میں نے کل بھی آپ کو فون کیا تھا مگر آپ دفتر سے غائب تھے۔ آپ آج کل کہاں گھومتے رہتے ہیں؟"

"خیابان سے جدا ہو کر ہرن صرا میں بیٹھ رہا ہے گل زیب۔"

مجھے گل زیب کے قہقہہ لگا کر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

"آپ پھر رومائنک ہو گئے اچھا خدا حافظ میں انتظار کروں گی۔"

"میں تمہیں انتظار نہیں کرنے دوں گا۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

میں دفتر سے نکل کر سیدھا مارکیٹ میں گیا۔ وہاں اس فکر میں مختلف سٹالوں پر منڈلانے لگا کہ زیب کے لئے کون سا تحفہ خریدا جائے۔ کشمیری شال؟ نہیں! مدراسی ساڑھی؟ حاجی جبار کے ہاں ساڑھی کا کیا کام! جانماز؟ البتہ۔۔۔۔۔! مگر اس مارکیٹ میں جانماز کا ملنا مشکل تھا۔ نہیں تو زیب کے لئے جانماز سے بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے جلدی میں وہاں سے چین کا بنا ہوا ایک بڑا خوبصورت ٹی سیٹ اور بنگلور کا بنا ہوا ایک نازک ہینڈ بیگ خریدا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر حاجی صاحب کی کوٹھی آگیا۔

شام ہو رہی تھی۔ سورج سمندر کی طرف غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر اکا دکھاتارے نکلنے لگے تھے اور کوٹھیوں کے آس پاس ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ گل زیب کی کوٹھی برقی قہقہوں سے جگ جگ کر رہی تھی۔ مہماں گاڑیوں سے اُتر اُتر کر اندر جا رہے تھے۔

میں بھی گاڑی سے اُتر اور کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ برآمدے میں حاجی صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ گلے بھی لگایا۔

"یار تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو۔ کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

حاجی صاحب کی بیگم بھی خندہ پیشانی سے ملیں۔ چھوٹی لڑکی مجھے ہال کمرے میں لے گئی۔ یہاں گل زیب زری کا جوڑا پہنے بڑی بن سنور کر اپنی سیلیوں میں بیٹھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ گل زیب نے مجھے دیکھا تو اٹھ کر میرے پاس آگئی۔

"میں نے انتظار تو نہیں کروایا؟"

زیب نے مسکرا کر کہا۔

"یہ تو انتظار کرنے والوں سے پوچھئے۔"

اس پر زیب کی سیلیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ میں نے زیب کو تنھے کا پیکٹ پکڑا دیا۔ ایک لڑکی بولی۔

"اس میں ترکی ٹوپی تو نہیں۔"

سب لڑکیاں پھر ہنس پڑیں۔ ان میں زیادہ تعداد پنجابی گھرانوں کی لڑکیوں کی تھی۔ کچھ بنگالی اور دو ایک سیلونی لڑکیاں بھی تھیں۔ بہر حال لڑکیاں خواہ کسی صوبے، کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ انہیں تو مذاق کے لئے کوئی موقع ملنا چاہیئے۔ پھر ان کی شوخی، شرارت اور زندہ دلی کو دیکھئے۔ بہر حال پیکٹ کھول دیا گیا۔ جینی ٹی سیٹ اور بنگلور کا پرس زیب کو بہت پسند آیا۔ ویسے بھی وہاں دو تنھے لے کر کوئی نہیں آیا تھا۔ زیب کی سیلیوں نے پرس کی بڑی تعریف کی۔ ایک بولی۔

"وصی صاحب بالکل عبور توں کی طرح سوچتے ہیں۔"

سب ہنس پڑیں۔ زیب نے کہا۔

"آپ ایک ہی تحفہ لے آتے۔ دو کی تکلیف کیوں کی؟"

"اگر مجھے علم ہوتا کہ یہاں اتنی خوبصورت لڑکیاں جمع ہوں گی تو میں تحفوں کا ایک ریڑھ بھر کر لے آتا۔"

ایک تیز پنجابی لڑکی بولی۔

"خدا کے لئے آپ ابھی چلے جائیئے۔ آپ کا ریڑھ تو باہر کھڑا ہی ہو گا۔"

پھر زوردار قہقہے لگے۔ اس کے بعد زیب نے لیک میں جلتی ہوئی موم بتیوں کو پھونکیں مار کر بجایا۔ ہر طرف سے تالیوں کا شور سنائی دیا۔ مہمانوں میں چائے اور دوسری مشروبات بانٹی جانے لگیں۔ حاجی صاحب نے مجھے اپنے دوستوں سے متعارف کروایا اور پاس بٹلا کر چائے وغیرہ پلائی۔ لوگ مجھ سے ریڈیو سیلون کے بارے میں عجیب بے ہنگم قسم کے سوال کرنے لگے۔ میں بہت جلد بور ہو گیا۔ میں دراصل زیب سے ملنے آیا تھا۔ اور اس کے ساتھ اس کی سیلیوں کی معیت میں وقت گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ چائے کے بعد مہمانوں نے ٹولیاں بنا کر باتیں شروع کر دیں۔ حاجی صاحب بھی کسی کام کو اندر چلے گئے۔ میں نے سگریٹ سگایا اور کوٹھی کے باغ میں ٹھٹھا ہوا ڈراڈور درختوں کے جھنڈ کی طرف نکل گیا۔ میں لوہے کے جنگلے پر پاؤں ٹکا کر سگریٹ پی رہا تھا۔ اور دوسری طرف کوٹھی کی روشن کھڑکی پر ہوا میں لہراتے ہوئے روشنی پردے کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کسی نے عقب سے مجھے آہستہ سے پکارا۔

"میں محل تو نہیں ہوئی؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ زیب کی ایک سیلی میرے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اسے ابھی ابھی گل زیب کے ساتھ دیکھا تھا۔ خوبصورت شکل و صورت کی لڑکی تھی۔ گول چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گورا رنگ، مناسب قد، شلوار قمیض اور دوپٹے میں ملبوس تھی۔ پچلا ہونٹ چوڑا تھا اور آلوچے کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ جسم صحت مند تھا اور ہمیشہ ہوتی قمیض میں جگہ جگہ سے باہر جھانک رہا تھا۔

"جی نہیں۔۔۔۔۔ کبھی لڑکی بھی محل ہوئی ہے بھلا۔"

وہ ذرا سا، ہنس پڑی اور کچھ شرما بھی گئی۔

"آپ ریڈیو سیلون پر کام کرتے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

"میں آپ کا پروگرام بڑے شوق سے سنا کرتی ہوں۔ مجھے آپ کے لکھے ہوئے فیچرز

بڑے پسند ہیں۔ اور آپ کی آواز بھی بہت پسند ہے۔"

"شکریہ! یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ ایسی خوبصورت لڑکی میرے پروگرام اور

خاص طور پر میری آواز کو پسند کرتی ہے۔"

لڑکی ضرور آگئی۔ لیکن ذرا پرٹھی لکھی اور ماڈرن ہونے کی وجہ سے وہاں سے نہ ہلی اور مجھ سے بے دھڑک باتیں کرتی رہی۔ میں نے پوچھا۔

"آپ پنجابی ہیں ناں۔"

"جی ہاں۔"

"سبحان اللہ! پنجابی چہروں کو تو یہاں ترس گیا ہوں۔ وطن کونسا ہے؟"

"گوجرانوالہ۔"

"سبحان اللہ! گوجرانوالہ سے کولمبو کیسے آگئیں آپ؟"

"ابا جان یہاں لکڑی کی ٹھیکیداری کا کام کرتے ہیں۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے جنگل کی ٹھیکیداری کرتے ہیں۔"

"جی ہاں! دراصل میں ان کے کاروبار سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ویسے اشاء اللہ جنگل کا آپ پر بھی اثر ہے۔ چہرہ

جنگلی گلاب کی طرح کھلا ہوا ہے۔"

اب کے وہ زیادہ ضرور آگئی۔ دراصل اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس سے اتنی بے تکلفی

سے باتیں کرنی شروع کر دوں گا۔ اور میں ہر لڑکی سے بے تکلف ہو جانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔"

"ثریا۔"

"گوجرانوالہ ٹائپ کا نام ہے۔"

"آپ کو اچھا نہیں لگا۔"

"کیوں نہیں؟ میں تو اس نام کی قسم کھا سکتا ہوں۔"

لڑکی مزہ دوسری طرف کر کے دیکھنے لگی۔ اس کے کپڑوں سے ایوننگ ان پیرس کی

خوشبو آرہی تھی۔ میری طرف آکر بولی۔

"کیا آپ کی نیگم بھی آپ کے ساتھ ہی کولمبو میں ہے؟"

میں ہنس پڑا۔

"ابھی بچہ ہوں۔ نیگم کا دودھ دور تک نشان نہیں۔ بوریلہ جنکشن والے چوک میں ایک

کوٹھی ہے اولس پیلس۔ اس کے ایک کمرے میں اکیلار ہوتا ہوں۔"

ثریا کے چہرے پر خوشی کی چمک سی آگئی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"آپ بڑی ہنسانے والی باتیں کرتے ہیں۔"

"وجہ میں تو ہنسا ہنسا کر ہیٹ کے سب بل نکال دیا کرتا ہوں۔"

"میں نے کسی دفعہ سوچا تھا کہ آپ کو خط لکھوں یا فون کروں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر نہ

کرتی کہ کہیں آپ کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں۔"

مجھے ثریا کی یہ بات کھٹکی۔

"اور کیا نہ سمجھ بیٹھوں؟"

"یہی کہ۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔"

وہ لڑکی خاموش ہو کر کھسیانی سی ہو کر ہنس دی اور میری شہ پر کھینے لگی۔

"دراصل ہم لڑکیاں غیر مرد کو خط لکھتے ہوئے ہمیشہ ڈرا کرتی ہیں۔"

"لیکن مجھے خط لکھتے ہوئے کسی لڑکی کو نہیں ڈرنا چاہیئے۔ میں تو صبح کی ہوا ہوں جو

پھولوں کا منہ چوم کر آگے گزر جاتی ہے۔"

ثریا کا منہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس نے منہ پر لی طرف کر لیا اور مجھے یوں محسوس ہوا

جیسے تیز ہوا میں گلاب کی ٹہنی ایک طرف کو جھک گئی ہو۔ مجھے اس لڑکی کا گول گول چہرہ،

سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اور آلو پے ایسا نیلا ہونٹ بڑا اچھا لگا تھا۔ دل نے کہا اس حسینہ سے بھی

اگر عشق ہو جائے تو کیا مصائب ہے۔ آخر پردیس میں دن بھی تو گزارنے ہوتے۔ اور پھر لڑکی

بھی صحت مند اور خوش شکل تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پنجابی تھی۔ یعنی گوجرانوالہ کی رہنے

والی تھی۔ جہاں کے خربوزے اور کیمچڑ بڑا مشہور ہے۔ عشق کرنے کا مزا تو کچھ اپنی زبان میں

ہی آتا ہے۔ اردو بولتے ہوئے تو یوں لگتا ہے جیسے آدمی جھوٹ بول رہا ہو۔ میں نے پوچھا۔

"آپ کی رہائش کہاں ہے؟"

"پٹیہ میں۔"

بہت خوب۔ ان لوگوں نے کولمبو میں بھی گوجرانوالے کو نہیں بھلایا۔ یہاں بھی ایسا

حملہ تلاش کیا جو گوجرانوالے کے نانک پور سے ملتا جلتا ہے۔ پٹیہ میں مسلمانوں کی کافی

آبادی تھی اور دو منزلہ مکانات گلی درگلی چلے گئے تھے۔ ثریا بولی۔

"اگر میں ریڈیو سیلون دیکھنے آؤں تو مجھے اجازت مل جائے گی۔"

"آپ جس روز آنا چاہیں مجھے فون کر لیں اور پھر بے شک جلی آئیں۔ آخر ہم وہاں کس لئے بیٹھے ہیں؟"

ثریا برمی خوش ہو گئی۔

"تو پھر میں آپ کو فون کر لوں گی۔ میرے ساتھ دو ایک سیلیاں بھی ہوں گی۔ کیا ان کے لئے بھی اجازت لینا پڑے گی؟"

میرا مزہ کرکرا ہو گیا۔

"یہ سیلیاں کیوں ہر لڑکی کے ساتھ لگی رہتی ہیں؟ آپ اکیلی ہی آئیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

ثریا نے مسکرا کر کہا۔

"میں اکیلی ہی آ جاؤں گی۔"

اتنے میں وہاں گل زیب بھی آ گئی۔

"ارے واہ! یہ آپ میری سہیلی کو الگ لئے کیا باتیں کر رہے ہیں؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے خلاف باتیں ہو رہی تھیں۔ ثریا کہہ رہی تھی کہ زیب نے چائے ٹھنڈی پلائی ہے۔"

"ارے واہ! آپ گرم چائے منگوا لیتے۔ کہیں آپ رومانٹک تو نہیں ہو رہے وصی صاحب؟"

میں نے سگریٹ جلا کر کہا۔

"اتنی خوبصورت رات میں جبکہ آپ ایسی لڑکیاں پاس ہوں تو میں کیا ایک رہچھ بھی رومانٹک ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔"

زہب اور ثریا قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ ثریا اور زہب خدا حافظ کہہ کر اندر چلی گئیں۔ میں کچھ دیر حاجی جبار اور انجم صاحب کے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر میں نے اجازت لی اور ٹیکسی میں سوار ہو کر گھر آ گیا۔

کوٹھی آیا تو اولس پیلس والوں کی مفل جی ہوئی تھی۔ کوٹھی کی چار دیواری کے اندر

لال میں ایک طرف میز لگی تھی اور شراب اڑ رہی تھی۔ مسز جونس، مسٹر جونس، سامنے والی بطخ نما لڑکی اور کانا عاشق بیٹھے تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ شراب دیسی تھی اور برمی ناپ تول کر پی جا رہی تھی۔ جب میں ٹیکسی میں سے دو گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی شراب ڈال کر انہیں ایک آنکھ سے سامنے کر کے دیکھ رہا تھا کہ کسی میں زیادہ شراب تو نہیں پڑ گئی۔ مجھے دیکھ کر مسز جونس نے خوشی کا ایک نعرہ بلند کیا۔ کرسی پر سے اٹھی اور میرا منہ چوم لیا۔

"میرا پیارا بیٹا آ گیا۔ اب مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ اب میں جو چاہوں گی مجھے مل جائے گا۔ کیوں میرے پیارے! تمہاری الماری میں میری پسندیدہ شراب تو ضرور ہوگی؟ یہ لوگ تو کنجوس کمپی چوس ہیں۔ دیکھو تو یہ شخص کس طرح بننے کی طرح ناپ تول کر رہا ہے؟"

میں نے مسکرا کر مسز جونس کا ہاتھ دبایا اور بازو تھپتھا کر کہا۔

"تمہیں شراب پلا کر مجھے خوشی ہوگی مسز جونس۔"

مسٹر جونس نے قہقہہ مار کر کہا:

"اور کیا ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے مسٹر وصی؟"

میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"مسز جونس کا ہر رشتے دار میرا پیارا ہے۔"

مسز جونس تو خوشی سے مجھے سے لپٹ گئی۔ میں نے بمشکل اس سے اپنا آپ چمڑایا۔ کیونکہ مسز جونس کے موٹے بدن سے باسی ناریل کی بو آرہی تھی۔ کمرہ کھول کر میں نے الماری میں سے واٹ 69 کی پوری بوتل اور سینئر سروس سگریٹ کے چار بڑے پیکٹ نکالے اور باہر لال میں آ گیا۔ مسز جونس کی باچیں کھل گئیں۔ اس نے ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں بوتل لی اور اس کا ڈھکنا دانت سے کھول کر اپنے گلاس میں انڈیلنے لگی۔ کانا عاشق بھی بڑا خوش تھا۔ اس نے ایرق کی دیسی شراب کی بوتل میں کارک گا کر اسے میرے پیچھے رکھ دیا اور اپنا گلاس خالی کر کے مسز جونس کے آگے رکھ دیا۔

"اب میں تمہیں بھی بننے کی طرح ناپ تول کر دوں گی۔"

کانے عاشق کی آنکھ پھر کھلنے لگی۔ وہ دو پیگ حلق میں انڈیل چکا تھا۔ مگر اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی محبوبہ نے صرف نصف پیگ ہی لیا تھا۔ مسز جونس نے اس لڑکی کو

کی طرف سے برٹی خوشگوار ہوا چل رہی تھی جس میں ناریل کے درختوں اور انٹاس کی خوشبو تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا کا سبز آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ سرٹکیں عالی عالی تھیں۔ آکا دکھا لوگ ادھر ادھر جا رہے تھے۔

گھنڈی ہوا لگنے سے میرا نڈ دوچند ہو گیا۔ دو ایک بار میرے قدم لٹکھڑا گئے۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو منجھا لے رکھا۔ کیونکہ میں مقدس ایلورا کے کوچے میں جا رہا تھا۔ اپنے محبوب کی نگلی میں جا رہا تھا۔ میں پہل روڈ کے فٹ پاتھ پر چوک والے بدھی مندر کی سمت چلا جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت ایلورا سے ملنا محال ہے۔ پھر بھی کوئی خبیث طاقت تھی جو مجھے کٹاں کٹاں اس کے گھر کی طرف لے جا رہی تھی۔ مسز جونز اور مسٹر جونز کا گھرانہ اچھے مخلص قسم کے لوگوں کا تھا۔ مگر میں ان میں بے تکلف ہو کر بھی ایک قسم کی اجنبیت محسوس کرتا تھا۔ ایلورا کے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں محسوس کر رہا تھا جیسے میں اپنے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ اپنے لوگوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ حالانکہ ایلورا میری زبان سے ناواقف تھی۔ ہم کبھی انگریزی اور کبھی ہندوستانی میں بات کیا کرتے تھے۔ ایلورا مدارس کی رہنے والی تھی۔ جس کا باپ سیلون میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ لیکن ہم دونوں ہندی تھے۔ ایک ہی مٹی سے ہمارا خمیر اٹھا تھا۔ ایک ہی باغ میں چلنے والی ہوا کے جھونکے تھے۔ ایک ہی شیلے سے ٹوٹے ہوئے شرارے تھے اور ایک ہی چٹے سے ٹکلی دو ٹدیاں تھیں۔

اب ایلورا کا گھر قریب آ رہا تھا۔ مجھے ہوا میں ایلورا کے بالوں کی مہک اور اس کے ہونٹوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔ میں سامنے والے فٹ پاتھ پر ہو گیا۔ اتفاق سے ایلورا کے گھر کے سامنے والا ریستوران ٹھکرا تھا۔ میں سرٹھیاں چڑھ کر ریستوران کے چبوترے کے پاس بیٹھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور کافی منگوا کر پینے لگا۔ ایلورا کے مکان کا لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی روشندان میں سے باہر چمن رہی تھی۔ دروازہ بند تھا بند دروازے کے شیشے کے آگے سُرخ پردہ گرا ہوا تھا۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ایلورا مکان کی دوسری جانب صحن میں چار پانی پر سو رہی ہے۔ اس کا ایک بازو رخسار کے نیچے ہے اور دوسرا سینے کے قریب سمٹا ہوا ہے۔ اس کی جادوگر آنکھیں بند ہیں اور ہونٹ ذرا سے کھلے ہیں۔ اس کے سفید سفید موتیوں ایسے داستانوں کی ایک جھلک

بھی ایک پیگ بنا کر دیا۔ وہ بھاگ کر اندر سے میرے لئے بھی ایک گلاس لے آئی۔ واٹ 69 کا دور شروع ہو گیا۔ کانا عاشق بغیر آواز کے شراب حلق میں ڈالتا اور چپکے سے خالی گلاس مسز جونز کے آگے سرکا کر خود سر جھکا کر چپکا ہو رہتا اور اپنی اکھوتی آنکھ سے اپنے گلاس کو دیکھتا رہتا۔ مسز جونز ساقی گری کا فرض انجام دے رہی تھی۔ اس کے باوجود سب سے زیادہ شراب کانا عاشق نے ہی پی اور سب سے کم نشہ اسی کو ہوا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بوتل خالی ہو گئی۔ مسز جونز نے لاجت سے میری طرف دیکھا۔ میں اندر جا کر کچھ بیئر کی بوتلیں اٹھا کر لے آیا۔ اب بیئر کا دور شروع ہو گیا۔ مسز جونز نے سالے دار آلو بنا رکھے تھے۔ انہوں نے بڑا مزہ دیا۔ رات کے گیارہ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ کانا کی محبوبہ نے تیسرے پیگ کے بعد ہاتھ کھینچ لیا تھا اور آرام کرسی کی پشت سے سرکا کر آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ کسی وقت گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ اپنے کانا عاشق کا ہاتھ دباتی۔ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتی اور پھر سر پیچھے لگا کر آنکھیں بند کر دیتی۔ مسٹر جونز نے حسب معمول صرف خاک کی نیکری ہی پہن رکھی تھی۔ وہ برٹی گر جوشی سے باتیں کر رہا تھا اور بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کی بیوی یعنی مسز جونز کا بھی تقریباً یہی عالم تھا۔ وہ اپنے خاوند کے منہ کرنے کے باوجود اندر جا کر اپنے دونوں بچوں کو جاکر انہیں جیب میں سے سوئٹ کے سٹکے دے آئی تھی۔ اور اب بار بار ان ہی کا ذکر کر رہی تھی۔

کانا عاشق کافی شراب پی چکے کے بعد اب بیئر کا دوسرا گلاس خالی کر رہا تھا۔ اسے نشہ چڑھ گیا تھا اور وہ حسب عادت اپنی گردن طوطے کی طرح دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔ مسٹر جونز بار بار سینے اور کندھے پر ہاتھ مار کر پھر رہا تھا۔ میں بھی تھے میں تھا۔ میں بیٹھا تو ان لوگوں میں تھا لیکن ذہن میں ایلورا کا دلکش سانولا سا ناولا قدیم ہندی چہرہ اور اس کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اچانک مسٹر جونز نے اپنے کھانے کا فرہ لگایا۔ سبھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور گرتے گرتے بچے۔ کانا عاشق اپنی بلیغ ایسی محبوبہ کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور خود لٹکھڑا گیا۔ اس کی محبوبہ نے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ سب لوگ اندر چلے گئے اور میں سگڑٹ سگڑٹ کر کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ میرا دل ایلورا کی یاد میں بے قرار تھا۔ میرے قدم بے اختیار ایلورا کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ بورلا چوک میں صرف چند ایک ریستوران کھلے تھے۔ عمارتوں میں کہیں کہیں خواب گاہوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ رات برٹی پر سکون، خشک اور مرطوب تھی۔ سمندر

دکھائی دے رہی ہے۔ لطیف تنفس سے اس کا سینہ آہستہ آہستہ اوپر نہچے ہو رہا ہے۔ سیاہ بال کھلے ہیں اور موتے کے دودھیا پھول دب گئے ہیں۔ رات کے سبز آسمان پر چمکنے والے سیلونی ستارے اسے گنگنی لگا کر سوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

میرادل چاہا کہ میں اُٹھ کر اس کے گھر میں چلا جاؤں اور ایلورا پر جھک کر اس کے نیم وا ہونٹ چوم لوں اور اس کے سیاہ بالوں میں لگا ہوا موتیا آنکھوں سے لگا لوں۔ ایلورا مجھ سے دس قدموں کے فاصلے پر سو رہی تھی۔ لیکن ہم دونوں میں ہزاروں میل کا فاصلہ حائل تھا۔ کروڑوں میل کی مسافت درمیان میں تھی۔ سات سمندر راستے میں پڑتے تھے۔ دھوپ میں تپتے ہوئے بے شمار صحرا خاک اڑا رہے تھے۔ میں ایلورا سے کیسے مل سکتا تھا؟ ایلورا مجھ سے کیسے مل سکتی تھی۔ وہ سو رہی تھی اور خواب میں مجھ سے ملنے ٹاور والے پل کی طرف چلی جا رہی تھی۔ کل صبح دو بجے وہ مجھ سے ملنے آرہی تھی۔ لیکن ہر ملاقات جدائی کی خبر سنا کر ختم ہو جاتی تھی۔ ہر ملاپ وصل کا پیش خیمہ تھا۔ شد کے ہر گھونٹ میں بڑھتی ہوئی تلخی کی آسیریز تھی۔ اتنے میں کمرے کی جی بھگتی تھی اور وہاں گھر اندھیرا چھا گیا۔ اب میرے لئے وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے بل ادا کیا اور بڑی احتیاط سے سیر مٹھیاں اُترنے لگا۔ اس خیال سے کہ کہیں ہوٹل والے مدارسی کو مجھ پر شرابی ہونے کا شبہ نہ ہو۔ لیکن وہ کمینڈ میری ضرورت سے زیادہ احتیاط کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ریسٹوران سے نکل کر چوک والے مندر کی طرف چل پڑا۔ مندر کا دروازہ بند تھا۔ سیر مٹھیوں پر کوئی پھول چپنے والی نہیں تھی۔ مندر کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ سیر مٹھیوں پر کہیں کوئی مٹلا ہوا کنول کا پھول پڑا تھا۔ میں سگریٹ جلا کر کتنی ہی دیر واں کھڑا مندر کی دیران سیر مٹھیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہاں سے واپس ہوا۔ فٹ پاتھ پر واپس گھر آتے ہوئے میں ایلورا کے مکان کے آگے سے گزرنے لگا تو قدم اپنے آپ ہی رک گئے۔ میں نے بند دروازے اور جھگے کو ہاتھ سے چھوا۔ اپنی پیشانی بڑی عقیدت سے دروازے کے پٹ سے لگائی۔ دل ہی دل میں ایلورا کو شب بخیر کہا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے اپنا آپ یوں ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی خزاں زدہ درخت سے ٹوٹ کر گرا ہوا زرد پتا ہوں اور کولمبو کی ہوا مجھے اڑانے لیے پھر رہی ہے۔

7

اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر گرتے ہی سو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ سر درد کر رہا تھا۔ یہ رات کو سکاچ میں دیہی بیسٹرا کر پینے کا اثر تھا۔ گھڑمی دیکھی تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ ریڈیو پروگرام کے شروع کرنے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ جلدی جلدی شیو کی، ہنایا اور کپڑے پہن ٹیکسی لے کر دفتر آگیا۔ جس وقت میں ریکارڈ اور خبریں لے کر سٹوڈیو میں داخل ہو رہا تھا ہندوستانی ٹرانسمیشن میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے۔ پورے ایک بجے گھر واپس آیا۔ کپڑے بدلے۔ کچھ روپے جیب میں ڈالے۔ تھوڑا بہت کھانا کھایا اور ایلورا سے ملنے بس میں بیٹھ کر ٹاور برج کی طرف چل پڑا۔ میرادل خوشی سے ناچ رہا تھا۔ آج ایلورا مجھے سہل روڈ سے باہر کولمبو کے کھلے اور پرفضا ماحول میں مل رہی تھی۔ بدھی مندر کی مذہبی اور قدیم فضا میں پریم کی باتیں کرنے والی پُراسرار لڑکی کو آج میں سمندر کے کنارے سیلون کی روشن دھوپ میں جدید عمارتوں کے درمیان دیکھوں گا۔ کیا وہ مجھے اجنبی سی نہیں لگے گی؟ ایلورا جدید دنیا کی باشندہ نہیں لگتی۔ وہ اس ماڈرن ماحول میں ناموزوں ہے۔

بس نے مجھے ٹاور برج کے شروع میں ہی اُتار دیا۔ میں نے گھڑمی دیکھی ایک بج کر پینتیس منٹ ہو رہے تھے۔ ایلورا کے درختوں میں ابھی پورے پچیس منٹ باقی تھے۔ دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی اور موسم گرم تھا۔ اگرچہ ہوا ٹھنڈی تھی اور سمندر کی طرف سے اس کے تیز جھونکے یہاں وہاں کھڑے تاڑ کے درختوں کو جھولا جھلا رہے تھے۔ شہر کے اس ماڈرن علاقے میں لوگوں، بسوں اور موٹروں کی بڑی ریل پیل تھی۔ زرد اور نیلے رنگ کی دو منزلہ بسیں بڑے وقار سے گزر رہی تھیں۔ پُل کے نیچے لائنیں بھی تھیں۔ ایک سبز رنگ کے ڈبوں والی لوکل ٹرین تیزی سے گزر گئی۔ ایک اینگلو سیلونی خوبصورت لڑکی چستری گلانے میرے قریب سے گزرنے لگی تو اس نے ایک پل کے لئے مجھے دیکھا اور پھر نظریں موڑ کر چلتی بنی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر بڑے مزے سے چلتا مارکیٹ کی طرف آگیا۔ یہ مارکیٹ منزلہ عمارت میں بنی ہوئی تھی اور اس کی ہر منزل میں -----

انگ انگ اشیا کا سٹور تھا۔ پہلی منزل میں بنیادی کامان اور دوسری منزل میں کپڑا اور تیسری منزل میں چمڑے کا سامان بکتا تھا۔ یہ کولمبو کی سب سے بڑی مارکیٹ تھی اور یہاں روزانہ ہزاروں کی بکری ہوتی تھی۔ میں نے ایک بنگالی کی دکان پر سے پان کھایا۔ کچھ در مارکیٹ کی پہلی منزل میں ٹھوم پھر کر چیزیں دیکھیں اور پھر باہر چھٹی ہوئی ڈیوٹی کے ایک ستون کے پاس جا کھڑا ہو گیا۔

یہاں سے مجھے بازار دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میری آنکھیں اس بس سٹاپ پر لگی تھیں۔ جہاں ٹمپل روڈ والی بس آ کر کھڑی ہوتی تھی۔ جب دو بج کر پانچ منٹ اوپر ہو گئے تو میں بے چین ہو کر ادھر ادھر ٹپٹنے لگا۔ کہیں ایلورا کو کوئی کام تو نہیں پڑ گیا؟ ایسا ہو سکتا تھا۔ لیکن دل بھتا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایلورا سب کام چھوڑ کر مجھ سے ملنے ضرور آئے گی۔ وہ مجھ سے جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتی۔ وہ ضرور آئے گی۔ بس اب آرہی ہوگی۔ آرہی ہوگی۔ اس کی بس اب میونسپل گارڈن کے سامنے سے گزر رہی ہوگی۔ اب وہ بلاپٹی کے چوک سے گزری ہوگی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ہلکے پیاز کی رنگ کی ساڑھی پہنے، ماتھے پر تنک لگانے فٹ پاتھ پر چلی آرہی ہے۔ یہ ایلورا تھی۔ تیز ہوا میں اس کی

ساڑھی کا ایک پلو اڑ رہا تھا۔ جسے وہ بار بار منہ بال رہی تھی۔ اس نے بھی دور سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ ذرا سی مسکرا دی۔ قریب آ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پیازی ساڑھی میں ماتھے پر سرخ تنک لگانے وہ پہلے سے زیادہ دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے بالوں کو کس کر پیچھے ان کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ اس طرح اس کا ماتھا پہلے سے زیادہ فراخ ہو گیا تھا۔ چہرہ گول نکل آیا تھا۔ جوڑے میں موتے کا ایک ہار لپیٹ رکھا تھا۔ کانوں میں سبز پتھر تھے۔ ناک میں کچھ نہیں تھا۔ پاؤں میں چپل اور کلائی میں سرخ رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ گہرا سا نولا رنگ دھوپ میں تھمتا رہا تھا۔ اس کے کپڑوں سے تان کی گرم خوشبو آرہی تھی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اس کے سلام کا جواب دیا۔ اور ہم چھتے ہوئے فٹ پاتھ پر سمندر کی طرف جانے والی سرک کی طرف چل پڑے۔

"میں تمہیں بس سٹاپ پر دیکھ رہا تھا ایلورا۔"

"میں بس میں نہیں آئی۔ میں اپنی ایک سیلی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ وہاں سے پیدل

آ رہی ہوں۔ اس کا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔ وہ تار گھر میں ملازم ہے۔"

"تمہیں گھر والوں نے باہر نکلنے کی اجازت کیسے دی؟"

ایلورا نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے گھر والوں نے باہر جانے سے روکا کب ہے؟ وہ تو میں خود کبھی کسی جگہ نہیں جاتی۔ میرے ماما پتاجی کو مجھ پر بڑا بھروسا ہے۔"

ہم نے فٹ پاتھ چھوڑ کر ایک کشادہ چوک عبور کر لیا۔ دوسری بڑی سرک کے فٹ پاتھ پر آ کر پھر ایک چوک میں سے گزرے۔ اب سامنے وہ سرک تھی۔ جس کے عقب میں خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کے سمندروں کا ملا جلا گہرا نیلا پانی سمندر کی بڑی بڑی موجوں کو ساحل کی طرف بھیج کر واپس بلا رہا تھا۔ اب ہوا تیز ہو گئی تھی۔ کیونکہ ادھر ادھر سر بفلک گنجان عمارتوں کی روک کہیں نہیں تھی۔ سمندر کے کنارے ذرا نیچے اتر کر ناریل اور ٹاڈ کے درختوں کے جھنڈوں کے جھنڈ شروع ہو جاتے۔ جو ساحل کے ساتھ ساتھ ماؤنٹ لیو نیا بیچ تک چلے گئے تھے۔ یہاں ایک بڑا خوبصورت کالج نما ریسٹوران تھا جس کی میزیں ناریل کے درختوں کے بیچ بیچ میں بچی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں اس ریسٹوران میں آ گئے اور ایک جگہ ناریل کے جھنڈ میں گھری ہوئی میز کے پاس بانس کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سمندر ہم سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ دھوپ میں اس کی لہریں چمک رہی تھیں۔ یہ لہریں درختوں کے تنوں کے درمیان سے ساحل کی ریت کا منہ دھلائی صاف نظر آرہی تھیں۔ ہوا خوب چل رہی تھی۔ یہ ہوا مرطوب تھی اور اس میں مچھلی کی بو تھی۔

ایلورا نے ساڑھی کو خوب اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ پھر بھی تیز ہوا اس کا ایک پلو اڑ رہی تھی۔ ماتھے پر آیا ہوا بالوں کا پھل لہرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کا رنگ دک رہا تھا۔ بھرے بھرے ہونٹوں پر شہد کا رس چمک رہا تھا۔ ہم کافی پینے لگے۔ ایلورا کبھی کبھی مجھے دیکھ لیتی اور پھر ناریل کے درختوں میں سے نظر آنے والے جھکیلے سمندر پر نظریں گاڑ دیتی۔ وہ اس جدید دنیا اور دن کے اجالے میں بھی راتوں کے کسی پرانے اور قدیم مندر کی دیو داسی سی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بڑی گہری اور پراسرار آواز میں حسب عادت سرگوشیوں کے سے انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اس کی زبان سے ایک ہلکی سی سکار پیدا ہو رہی تھی۔ جسے سن کر مجھے اس سیاہ ناگ کا خیال آ جاتا تھا جو جھڑے ہوئے خشک پتوں پر سے گزر رہا ہو۔

میں نے سگڑےٹ سگاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں جلدی تو واپس نہیں جانا ایلورا؟"

ایلورا نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں شام تک سہیلی کے ہاں رہ سکتی ہوں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آج ایلورا شام تک میرے ساتھ ہوگی۔ دراصل میں نے پروگرام ہی یہ بنایا تھا کہ تین بجے تک ریستوران میں بیٹھ کر کافی پیئیں گے۔ سمندر کی سیر کریں گے اور اس کے بعد سینما دیکھنے کسی سینما ہال میں گھس جائیں گے۔

میں ایلورا کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر اس کے ہونٹوں، رخساروں، ہاتھوں، بازوؤں بلکہ سارے جسم کو جی بھر کر پیار کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے ایلورا سے سینما کا ذکر کیا تو اس نے سمندر کی طرف بدستور دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

ایلورا کو صرف میری خوشی اور خوشنودی منظور تھی۔ میں اس کے اس جذبے سے

بے حد متاثر ہوا۔ میں نے سگڑےٹ کا کش لے کر کہا۔

"لیکن تم سمندر کی جانب کیا دیکھ رہی ہو؟"

ایلورا میری طرف دیکھ کر ذرا سی مسکرائی اور کہنے لگی۔

"مجھے اپنے دیس کا ایک لوک گیت یاد آ رہا ہے۔"

"تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں۔"

"گا کر سناؤ گی؟"

"سنا سکتی ہوں مگر یہاں نہیں۔ میں تمہیں ترجمہ سناتی ہوں۔"

اس کے بعد اس نے ایک گھرا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر خشک آواز میں

بولی۔

"یہ گیت ایک ہرنی کی فریاد ہے۔ حقیقت میں اس میں ہندوستان کی ہر عورت کی

پیتا اور دکھ درد سمو یا ہوا ہے۔"

اب اس نے اپنے دیس کے لوک گیت کا ترجمہ کر کے سنایا جو یہ تھا۔

"----- کس طرف سے ہرنی آئی؟ وہ آسم کے پیڑ تلے کھڑی ہے۔ پورب

کی طرف سے ہرنی آئی۔ وہ آسم کے پیڑ تلے کھڑی ہے۔ کس طرف سے شکاری آیا؟ اُس

نے ہرنی کو تیر مارا۔ بچھم کی طرف سے شکاری آیا۔ اُس نے ہرنی کے تیر مارا۔ شکاری نے

ہرنی کے دم پر تیر مارا۔ ہرنی بھاگ گئی۔ ہائے اسے کتنا دکھ ہوا۔

----- ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو تنہا چھوڑ گیا۔

ہرنی ہرن کی تلاش میں ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے سارا جنگل چھان مارا۔ ہرن کے بغیر ہرنی

تنہا ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو لیکے چھوڑ گیا۔----- کمبیں نہ وہ ملا، وہ ظالم ہرن۔ بار بار

اس نے وہ جنگل چھان مارا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو لیکے

چھوڑ گیا۔

----- ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہرنی تک گئی۔ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلا چھوڑ گیا۔ چکر کھا کر ہرنی گر

پڑی۔ یہ دکھ سہا نہیں جاتا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو لیکے

چھوڑ گیا۔

----- میرے ہرن کو نہ مارنا۔ ہماری قطار سوئی ہو جائے گی۔ راجہ ہم ہرنیوں

کو مار لے۔ ایک دو۔ چاہے چار۔----- مجھے مار لے جاؤ۔ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ ہم تو اپنے

پیا کے کھیت میں چرتے ہیں۔ ہمارے ہرن کو مت مارو۔ کس سمت کے شکاری ہو؟ کس

سمت کو جا رہے ہو؟ آگے کی سمت کے شکاری ہو؟ پورب کی طرف جا رہے ہو؟ ہمارے

ہرن کو نہ مارو۔ کس چیز کی کھونٹیاں ہیں؟ کس چیز کی تانتیں ہیں؟ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔

----- ارے او شکاری! میری بات سن لے! میری بات مان لے۔ شکاری

میری بات مان لے۔ جب شکاری نے پھندہ لگایا۔ ہرنی کو دکر بفل میں جا کھڑی ہوئی۔ ہرنی

کا پاؤں پھنس گیا۔ رام! ہرنی کا پاؤں پھنس گیا۔ ہرنی کھڑی ہوئی آنسو گرا رہی ہے۔ او ہرن

! میری بات سن لے تو تو اس پھندے میں پھنس گیا۔ میرا کیا حال ہوگا۔

او ہرن میرا کیا حال ہوگا؟

----- ہرن کھڑا ہوا یہ سمجھا رہا ہے۔ ہرنی! میری بات سن لے۔ اس کے گھر کا

خرچ بڑھ گیا ہے۔ اس نے میرا گوشت بیچ کر گزارہ کر لینے دے۔ ہرنی اسے میرا گوشت بیچ

کر گزارہ کر لینے دے۔

----- اتنی بات سن کر شکاری آگے بڑھا۔ اس نے پھندا اکاٹ دیا۔ ہرنی آنسو گرا رہی ہے۔ جنگلوں نے پھر سے جوڑی ملا دی جوڑی ملا دی۔ شکاری! پھر سے جوڑی ملا دی۔

گیت واقعی بڑا دردناک تھا۔ اس لوک گیت میں ایک ہندی عورت کے جذبہ قربانی اور مامتا کی پکار تھی۔ ایلورا خاموش ہو گئی اور اس نے سر کرسی کی پشت سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت وہ کوئی عہد ماضی کی عورت معلوم ہو رہی تھی۔ یا وہ ہرنی جس کا ہرن جنگل میں اسے اکیلا چھوڑ گیا ہے۔ جس نے جنگل کا کونہ کونہ چھان مارا ہو لیکن ہرن کا کوئی پتہ نہ چلا ہو۔ سمندر کی لہروں کا شور بلند ہو رہا تھا۔ اوپر نارمل کے درختوں کی ٹہنیاں جھول رہی تھیں۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے ٹکل آئے تھے۔ سورج کبھی بادلوں میں چھپ جاتا اور کبھی باہر ٹکل آتا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"ایلورا! کہیں یہ تمہارے ہی زخمی دل کی پکار تو نہیں تھی؟ کیا تمہارا ہرن بھی تمہیں چھوڑ کر جنگل میں کہیں گم ہو گیا ہے؟"

ایلورا نے آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں غروب شام کی روشنی جھللا رہی تھی۔ کچھ دروہ چپ چاپ گاہوں سے مجھے ٹکتی رہی۔ پھر ذرا سا مسکرائی اور کہنے لگی۔

"عرصہ ہوا میرا ہرن مجھے سنان جنگل میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں اس کی تلاش میں کئی صدیوں تک ماری ماری پھرتی رہی۔ میں نے ہندوستان کا کوئی جنگل، کوئی ویرانہ نہ چھوڑا۔ آخر میرا ہرن مجھے مل گیا۔"

مہماں سے؟

"کو لمبو کی ایک سرک پر سے۔"

"کو لمبو میں؟"

"ہاں کو لمبو میں۔۔۔۔۔ میں ایک روز اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑی تھی کہ

(یہ لوک گیت کیمرج یونیورسٹی کے پروفیسر E W COEELL کی لوک گیتوں کی کتاب THE JATAKA سے لیا گیا ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں ہندی لوک گیتوں کو مرتب کیا ہے۔)
(مصنف)

اچانک میری نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ ٹریم میں بیٹھا کہیں جا رہا تھا۔"

ایلورا پھر سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔ میں خاموش ہو گیا۔ کچھ نہ بولا۔ ایلورا نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے راز کو چھپڑ دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس موضوع پر کبھی پوری بات نہیں کرے گی۔ بھولی لڑکی جانے کیوں اور کس طرح یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میں کہیں اُسے پہلے جنم میں بھی ملا ہوں۔ کہاں ملا ہوں؟ کس روپ میں ملا ہوں؟ یہ باتیں وہ مجھے کبھی نہیں بتاتی تھی۔ میں نے کئی بار پوچھنے کی کوشش کی مگر اس نے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے آج جب اس نے خود اس موضوع پر بات شروع کر دی تو میں نے پوچھا۔

"ایلورا! خدا کے لیے مجھے بتاؤ۔ آخر یہ کیا راز ہے؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ میں پہلے سے بھی تمہیں کسی جنم میں مل چکا ہوں؟"

ایلورا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"اگر یقین نہ ہوتا تو میں ٹریم میں تمہیں پاگلوں کی طرح دیکھتی کیوں چلی جاتی؟ تم نے تو میری سینکڑوں سالوں کی نیند کو توڑ دیا۔ مجھے تمہارا پھلے جنم کا روپ اسی طرح یاد ہے جس طرح تم اس وقت آج کے روپ میں میرے سامنے بیٹھے ہو؟ کیا تمہیں کچھ بھی یاد نہیں؟"

میں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہا۔

"کم از کم مجھے تو کچھ یاد نہیں پڑتا۔ میرا تو خیال ہے کہ میں نے زندگی میں پہلی بار تمہیں دیکھا ہے۔ اگر پہلے بھی کہیں دیکھا ہوتا تو میں کیسے بھول سکتا تھا؟"

ایلورا نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"یہ تمہارا وہم ہے۔ آہ! تم اتنی جلدی بھول گئے؟ میں نہ جانتی تھی۔

جب میں تمہیں ایک ایک بات یاد دلادوں گی تو تمہیں سب کچھ یاد آ جائے گا۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے یاد دلانا ایلورا بتاؤ میں پہلے جنم میں کیا تھا؟ کہاں تھا؟ تم سے میرا کیا رشتہ تھا۔

کیا رشتہ تھا ایلورا؟"

ایلورا نے گھبرا کر سر کو جھٹک دیا۔ وہ کرسی پر سے اٹھی سمندر کی طرف دیکھ کر ایک

آہ بھری اور مسکرا کر بولی۔

"سینما کا وقت ہو رہا ہے۔"

میں اس سے آگے کوئی بات نہ کر سکا۔ میں نے سگریٹ کیس اٹھا کر جیب میں رکھا۔ بل ادا کیا اور ایلورا کو ساتھ لے کر سرک پر آ گیا۔ اب آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ دھوپ غائب ہو گئی تھی۔ اور ہوا بھی بند ہو گئی تھی۔ یہ بارش کی نشانیاں تھیں چوک میں آکر ہم نے ٹیکسی لی اور میٹر و سینما کی طرف چل پڑے۔

کوئی انگریزی فلم لگی تھی۔ یہ سینما گال روڈ پر واقع تھا اور اس کا اگلا رخ سمندر کی طرف تھا جدھر ناریلوں کے جھنڈ بند ہوا میں دم سادے کھڑے تھے۔ میں ٹکٹ لے رہا تھا کہ بارش ہونے لگی۔ ہونے ایک دم زور سے شروع ہوا اور بڑی زبردست آواز کے ساتھ۔ یوں لگا جیسے سامنے سے کوئی ٹرک آیا اور سینما کی عمارت کے اوپر سے گزر گیا۔ باہر کھڑے لوگ ہچک کر

سینما کی لابی میں آ گئے۔ میں اور ایلورا اوپر کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ سینما ہال کی ڈھلوان چھت پر بارش نے شور مچا رکھا تھا۔ اندر کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ایلورا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کا ہاتھ گرم تھا اور کیبن کے پینکے کی تیز ہوا میں اُس کے ہاتھ پر بالوں کی ایک لٹ اڑ رہی تھی۔ اس کے جوڑے میں لگے پھولوں کی میٹھی خوشبو اُس کے بالوں کے خوشبودار تیل کی مہک میں مخلوط ہو رہی تھی اور مجھے اُن قدیم مندروں کا خیال آ رہا تھا۔ جہاں چاندنی راتوں کی پر اسرار فضا میں لوہان اور عود کے دھوئیں میں آگ روشن ہو اور کسی مقدس دیوتا کی شادی ہو رہی ہو۔ پھول اور تیل کی مٹی جلی خوشبو نے دیوالائی فضا پیدا کر دی تھی لیکن اس میں ایک قسم کی جنسی کشش اور بلوا ابھی تھا جو مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے ایلورا کا ہاتھ دبا دیا۔ اُس نے میری طرف کنگھیوں سے دیکھا اور ایک گھبراہٹ سے کہہ دیا کہ غاموش ہو رہی۔ بارش کا زور ٹوٹا تو اس کا شور بھی کم ہو گیا۔ اب ہم ایک دوسرے سے باتیں کر سکتے تھے۔ فلم شروع ہو گئی۔ لیکن ہم میں سے کسی کو بھی فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم وہاں فلم دیکھنے نہیں آئے تھے۔ بلکہ اس لیے آئے تھے کیونکہ وہاں تنہائی میں بیٹھ کر ہم ایک دوسرے سے باتیں کر سکتے تھے۔ یا ایک دوسرے سے محبت کر سکتے تھے۔ کیونکہ باتیں کرنے سے محبت کرنا ہمیں زیادہ بہتر ہے۔ میں نے ایلورا کا ہاتھ چوم لیا۔ ایلورا نے میری طرف ہلکے سے مسکرا کر دیکھا۔

"ایلورا! مجھے تو یہ سب کچھ خواب معلوم ہو رہا ہے۔ تم کسی اور دیش کی رہنے والی ہو

میں کسی دوسرے دیش کا باشندہ ہوں۔ ہم ایک اجنبی ملک میں بارش اور ہوا کے طوفان میں ایک پل کے لیے بیٹھے ہیں اور پھر جدا ہو جائیں گے۔ تم کہیں اور چلی جاؤ گی۔ میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ پھر نہ کبھی تمہیں میری خبر ملے گی اور نہ مجھے کبھی تمہاری خبر ملے گی۔ ہم نے وقت کے ان رنگین لمحات کو صرف بھوا ہے۔ جس طرح کوئی تتلی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے ذرا سا بھولا دیتا ہے اور اس کے ہاتھ میں تتلی تو نہیں آتی مگر اس کے رنگ ضرور لگ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد یہ رنگ بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ تم ہی کہو کیا یہ سب کچھ خواب نہیں ہے؟"

ایلورا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"جسے تم خواب کہہ رہے ہو یہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ خواب اصل زندگی ہے۔

ہم زندگی کو بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں تقسیم کر سکتے ہیں لیکن خواب کو کبھی تقسیم نہیں کر سکتے۔ زندگی کا یہ وقفہ جو پیدائش سے شروع ہو کر موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ ایک طویل خواب کی بیداری کا نام ہے۔ اس بیداری میں کبھی کبھی ہمیں اوگھ آ جاتی ہے اور ہمیں ہماری اصل زندگی اپنی جھلک دکھلا جاتی ہے کبھی سوچو تو۔۔۔۔۔ کیا کسی نے آج تک یہ بتایا ہے کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ کس قسم کی زندگی شروع ہوتی ہے؟ ہم کہاں چلے جاتے ہیں؟ پھر ایک ایسی نامعلوم اور غیر یقینی منزل کے سفر کے لیے ہم لوگ اتنا اہتمام کیوں کرتے ہیں؟ اتنی جدوجہد کیوں کرتے ہیں؟ اتنا جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ اتنی برائیاں کیوں کرتے ہیں؟۔۔۔۔۔ اتنے لوگوں کا حق کیوں مارتے ہیں؟ ہم ایک ایسی شے کو حقیقت کا نام کیونکر دے سکتے ہیں جس کی حقیقت کا ہی علم نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"نہیں ایلورا! زندگی بسر کرنا بذات خود ایک بہت بڑی حقیقت اور بڑا عظیم تجربہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اس کی نوعیت سے بے خبر ہیں۔ اس کے باوجود قدرت کا یہ ایک بہت بڑا عطیہ ہے جو انسان کو ملتا ہے اور ہمیں اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔"

"لیکن اُس فائدے کا کیا مقصد جس کے نقصان سے ہم بے خبر ہیں۔ ہو سکتا ہے جسے ہم فائدہ سمجھتے ہوں وہ حقیقت میں نقصان ہو۔ ہم ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت پیدا

رکے اپنی اولاد کو پالتے ہیں۔ ان کے لیے جائیداد چھوڑ کر مرتے ہیں۔ اور بعد میں یہی جائیداد نسل و خون کا باعث بنتی ہے۔ ہماری اولاد بعد میں ہمیں بھول جاتی ہے۔ ایک صدی تک ہماری تصویر ان کے ڈرائنگ روم میں لگی رہتی ہے۔ پھر ان کی اولاد کی اولاد ہو جاتی ہے۔ ہماری تصویر کی جگہ ہمارے کسی پوتے یا پڑپوتے کی تصویر لے لیتی ہے۔ پھر وقت کے غبار میں وہ تصویر بھی معدوم ہو جاتی ہے اور ہمارا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ کسی کو ہمارا نام بھی یاد نہیں رہتا۔ مثلاً مجھے اپنی پڑثانی اور اس کی نانی اور اس کے باپ کا نام نہیں معلوم۔ میں نہیں جانتی کہ وہ لوگ کیا کرنے آئے تھے اور کیا کر کے چل دیے۔"

میں نے سگریٹ سلا کر کہا۔

"زندگی کا چکر اسی طرح رواں دواں ہے ایلورا۔۔۔۔۔ اور پھر میں کسی بھی دلکش آنکھوں اور خوبصورت ہونٹوں والی لڑکی سے بحث نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر جبکہ باہر بارش ہو رہی ہو اور اُس لڑکی کے جوڑے میں لگے ہوئے پھولوں کی مہک اڑ رہی ہو۔"

ایلورا مسکرائی اور اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ میں اپنا چہرہ اس کے قریب لے گیا۔ اتنا قریب کہ فلم کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے اس کی چمکتی ہوئی شہرتی آنکھیں اس جھل کی طرح دکھائی دینے لگیں جہاں شام کی روشنی رات کے اداس اندھیروں میں گھل مل رہی ہو۔ مجھے اس کے تنفس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور اس کا گرم گرم خوشبو دار سانس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہا تھا۔ جوڑے کے پھول کی خوشبو تیز ہو گئی تھی۔ خوشبو دار تیل کی مہک زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ ایلورا کا گہرا سا نولا گرم کنوارا جسم محبت بھرا دل بن کر دھڑک رہا تھا۔ اس کے بھرے بھرے آلوچے ایسے رسدار ہونٹ ذرا سے کھلے تھے اور دانتوں کی لکیر اس طرح نظر آرہی تھی جس طرح تڑنے ہوئے ناریل میں سے سفید سفید گودا نظر آیا کرتا ہے۔ میں نے ناریل کے اس شگاف پر ہونٹ رکھ دیے اور اس کا سارا رس ساری خوشبو میرے جسم میں پھیل گئی۔ مجھے اپنے آپ پر ناریل کے درخت کا گمان ہوا جو کسی دریا کے کنارے اکیلا کھڑا جنوبی سمندروں سے آنے والی ہواؤں میں جمو رہا ہو۔ ایلورا کے ہونٹ گرم تھے۔ یہ وہ ناریل تھا جو گرم دھوپ میں اپنی شاخ پر سے ٹوٹ کر گلاس پر گر پڑا ہو اور ٹوٹ گیا ہو۔

میں نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ایلورا کی آنکھیں بند تھیں۔ سر کرسی کی پشت سے لگا تھا اور اس کے براؤں ہونٹوں پر میرے بوسے کا نشان چمک رہا تھا۔ میرے پیار کا پھول مہک

رہا تھا۔ وہ گہرے سانس لے رہی تھی اور اس کا بلاؤز اوپر کھینچے ہو رہا تھا۔ ساڑھی کا پلو اس کے شانوں پر سے پھسل گیا تھا اور صندلیں بازو نکلا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا سر ایلورا کے بازو پر رکھ دیا۔ ایلورا نے بازو میری گردن میں حائل کر دیا اور میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ زندگی میں خواب سب سے بڑی حقیقت ہوتے ہیں۔ ہم پیدا ہی اسی لیے ہوتے ہیں کہ ایسے خواب دیکھیں لیکن یہ خواب ہمیں زندگی بھر میسر نہیں آتے۔ ہم دولت کھاتے ہیں۔ صبح سے شام تک پہلے اپنے لیے، اپنے ماں باپ کے لیے اور پھر اپنی اولاد کے لیے، کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتے رہتے ہیں۔ ہم جانوروں کی طرح کام کرتے ہیں۔ روٹی کھاتے ہیں، سہے پیدا کرتے ہیں اور مرتے ہیں۔۔۔۔۔ جب کوئی ہم میں سے اٹھ کر بغاوت کرتا ہے اور خواب دیکھنے شروع کر دیتا ہے تو ہم اسے اپنی مغل سے اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں، اس پرزے کی طرح جو بیکار ہو گیا ہو لیکن ہمیں خبر نہیں ہوتی کہ حقیقت میں وہی بیکار پرزہ اس سارے نظام کی خوبصورتی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ یہی خواب زندگی کی خاردار جھاڑیوں پر لگے ہوئے پھول ہیں۔ ہمارا کام صرف کانٹے پیدا کرنا، کانٹے صاف کر کے اپنی راہ بنانا اور پیچھے آنے والوں کے لیے مزید کانٹے پیدا کرنا ہے۔ پھول پیدا کرنا بالکل نہیں۔ اگر یہ خواب دیکھنے والے، یہ پھول پیدا کرنے والے دیوانے نہ ہوں، تو یہ دنیا ایک ایسی کانٹوں بھری وادی بن جائے جہاں پر انسان لہو لہان اور کانٹوں سے چھدا ہوا نظر آئے۔ یہ دور فائدے اور نقصان کا دور ہے۔ اجارہ داری خود غرضی اور منصب پرستی کا دور ہے۔ ہر شخص اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے حال کو زبردست کر رہا ہے۔ وہ گھوڑے کی طرح بے معنی مشت کرتا ہے مگر کھاتا چوبیا کی طرح ہے۔ وہ ایک جھوٹی بے حقیقت اور خود پیدا کردہ محنت اور مشت میں لگا ہے۔ جب وہ تنک ہار کر اپنے بچوں میں بیٹھ کر خوش ہونے کی کوشش کرتا ہے یا کسی سینما یا دریا کنارے جا کر گھڑی کی گھڑی تفریح کرتا ہے اور اپنی کولہو کے بیل ایسی زندگی کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے تو وہی لمحات اس کی زندگی کے وہ حقیقی لمحات ہوتے ہیں جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن صد حیف کہ وہ ان لمحات کو بیکار کچھ کر صانع کر دیتا ہے اور تھوڑی دیر بعد پھر کولہو کے آگے جت جاتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو بھلانے اور خوش کرنے کے لیے احساسِ فرض، ذمہ داری، ایثار، کیشی، محنت، اور قربانی ایسی بے معنی اصطلاحیں گھڑ رکھی ہیں۔ جب کوئی

شخص کام کرتے کرتے گر کر مر جاتا ہے تو اس کے سینے پر احساسِ فرض و ذمہ داری یا قربانی کا خود ساختہ اور جموٹا تمغہ لگا کر اس کی طیرِ قدرتی موت پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قدرت نے انسان کے لیے درخت بنائے ہیں۔ جو پھل دیتے ہیں۔ سایہ دیتے ہیں۔ پھولوں کی خوشبو اڑاتے ہیں۔ اس نے انھوں نے کمپنیاں نہیں بنائیں جس کے لمبٹ بول بول کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ قدرت نے زمین بنائی ہے۔ ریلوے لائن نہیں بنائی جو ہر روز کئی انسانوں کی لاشوں کو کاٹ کاٹ کر ان کے گھروں کو ماتم کدے بنا رہی ہیں۔ ریل، ہوائی جہاز، بجلی، کارخانے۔۔۔۔۔ تہذیبِ حاضر کی یہ جتنی کارگمیں ہیں، ان کے فائدے ضرور ہیں۔ لیکن یہ سارے فائدے ایک خاص طبقہ حاصل کرتا ہے اور اس کے سارے نقصانات نچلے طبقے کے حصے میں آتے ہیں۔ ریل کے بچے کبھی اصلی درجے کا مسافر کٹ کر ہلاک نہیں ہوتا۔ لائن پر ہمیشہ کسی دیہاتی عورت یا دیہاتی آدمی کی لاش ہی ملے گی۔ بجلی کا ہمیں صرف اتنا فائدہ ہے کہ ہمارے گھر میں بلب جلتا ہے۔ بجلی کی مدد سے جو کارخانے اور مشینیں چلتی ہیں اس کا سارا فائدہ ایک خاص طبقہ ہی اٹھاتا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے گھروں کے ہزاروں مستری بارش میں کھجے پر چڑھے تاریں ٹھیک کرتے بجلی کے جھکے سے مر جاتے ہیں۔ سیکٹرل عورتیں اور بچے گھروں میں بیٹے اور ننگے تاروں سے چھو کر جان بحق ہو جاتے ہیں۔ یہ جدید ترقی اور مائتسی دور کے مفادات کا ڈھونگ تو ایک ایسی مرغی ہے جو دانہ دنگا تو ہمارے گھر سے کھاتی ہے اور انڈا دوسرے کے گھر میں جا کر دیتی ہے۔ ہمیں یہ جنس بڑی مہنگی پڑ رہی ہے۔ ہمیں یہ ساری چیزیں اتنا فائدہ نہیں دے رہیں۔ جتنا نقصان پہنچا رہی ہیں۔ یہ جتنا کچھ ہم سے لے جاتی ہیں اس کا عشرِ عشر بھی یہ ہمیں واپس نہیں کو تیں۔ اس دنیا میں ہزاروں ایسے دیہاتی ہیں جو کبھی ریل پر سوار نہیں ہوئے لیکن جو ریل کے بچے آکر کٹ جاتے ہیں۔ سیکٹرل ایسے لوگ ہیں جنہیں بجلی کی روشنی نصیب نہیں۔ مگر بجلی کے تاروں میں الجھ کر مر جاتے ہیں۔ جنہیں تن ڈھانپنے کو پورا کپڑا بھی نہیں ملتا لیکن کپڑے کی ملوں میں کسی مشین میں آکر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ زمین دوز کا نوں میں سے کوئٹہ نکال نکال کر گاڑیوں میں لدا جاتا ہے جس سے بڑے بڑے کارخانے چلتے ہیں۔ نئی نئی کاریں خریدی جاتی ہیں۔ نئے نئے بنگے بنائے جاتے ہیں۔ بچوں کو کاروں میں سکول لے جایا جاتا ہے۔ شہینہ کلبوں میں عورت اور شراب پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ لیکن کوئٹے کی کان میں جب بھی دھماکہ ہوتا ہے

تو مرتا وہی شخص ہے جسے سردیوں میں آگ تاپنے کو کوئٹہ بھی میسر نہیں۔ اس کوئٹے کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے کے جسم پر خراش تک نہیں آتی۔ تو آخر یہ ساری بک بک کس لیے؟ کیوں نہ انسان جنگل میں ننگا ہو کر ٹھل جائے اور درختوں کے پھل کھا کر اور چٹے کا پانی پی کر سو جایا کرے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اسے جنگل میں، پھر، جنگلی درندے، چیونٹے، بگے اور سانپ بچھواتی تکلیف نہیں دیں گے جتنی تکلیف اُسے شہروں میں اس کے انسان بنائی پہنچا رہے ہیں۔ کم از کم مجھے تو بجلی، ریل، ہوائی جہاز اور ٹیلی ویژن کی اتنی شدید ضرورت نہیں کہ میں محض اس کی خاطر اپنی ماں کو ریل تے کٹوا دوں۔ بنائی کو بجلی کے جھکے سے مروا دوں اور بچے کو کوئٹے کی کان کے دھماکے میں ہلاک کر دوں۔

برادرانِ کرام! مجھے تو آپ ایک بیل گاڑی، ایک سانولے بدن کی نیم عریاں لڑکی، پانی کا ایک چشمہ، کیلون کا گچھا اور گھنے جنگل کو جانے والا ایک بچہ راستہ دے دیں اور میرا آپ کو دور ہی سے سلام!

میں نے اپنے ساتھ بیل گاڑی میں لیٹی ہوئی نیم عریاں سانولی لڑکی کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ ایلورا نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ہونٹ کھول دیئے۔ میری زبان ٹارسل کے پھول کو چوسنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کوئٹہ کو چوم رہا ہوں۔ کوئٹہ کا رس پی رہا ہوں۔ کوئٹہ کے سمندر میں بازو پھیلانے جنوبی تیز ہواؤں میں اڑا جا رہا ہوں۔ اچانک کین کے دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ میرا خواب ٹوٹ گیا۔ بیل گاڑی ریلوے پٹا تک پر آکر کھڑی ہو گئی۔ میں ایلورا سے الگ ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اپنی مٹی میں بند نئے سے خوشبودار ریشمی رومال سے اپنے ہونٹ پونچھے۔ مارٹھی کا پلو درست کیا اور پھر سے اس دنیا کی ہوشیار اور ہلاک لڑکی بن کر بیٹھ گئی۔ وہ جنگل کی گوالن غائب ہو گئی۔ میں نے بھی اپنی دیہاتیوں والی پگڑی پر سے پھینکی۔ کیلون کا گچھا سیٹ کے بچے کیا اور ثانی درست کر کے کین کا دروازہ کھول دیا۔

معلوم ہوا کہ انٹرول ہو گیا ہے اور بیرا کافی لے کر آیا ہے میں نے اس بیرے کو پہلے ہی سے کھہ رکھا تھا۔ وہ کافی رکھ کر چلا گیا۔ ہم کافی پینے لگے۔ پٹکے کی تیز ہوا میں ایلورا کے ماتھے پر بانوں کی ایک لٹ اڑ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور اپنے ریشمی رومال سے میرے ہونٹوں پر ایک طرف لگا ہوا سرخی کا نشان پونچھ ڈالا۔ میں نے کہا۔

بھرے کھیت میں دھان کی پنیری بویا کرتے تھے اور وہ لڑکی تمہارے لیے دال بھات پکایا کرتی تھی۔ چاول کوٹا کرتی تھی۔ بچی میں چاول پیسا کرتی تھی۔ سل پر مرچیں اور املی پیسا کرتی تھی۔ رات کو تمہارے پاؤں داہا کرتی تھی۔ تمہیں کھیتوں میں لسی کا کٹورا دینے جایا کرتی تھی؟ جو تمہارے بچوں کو خود جاگ کر سلایا کرتی تھی۔ صبح صبح ان کا منہ دھلایا کرتی تھی۔ انہیں بھگوان کی پوجا کروانے مندر لے جایا کرتی تھی۔ شام کو جب تم کھیتوں سے گھر آتے تو وہ ننھے منے تمہاری ٹانگوں سے لپٹ جایا کرتے تھے۔ تمہارا نام ویشنو تھا اور میرا نام ونٹی۔ پھر ہم نے لہنی لڑکی بنی کی شادی کی تھی۔ تم نے اپنے ہاتھوں بنی کو اس کے خاوند کے حوالے کیا تھا۔ کیا تمہیں کچھ بھی یاد نہیں؟ کیا تم سب کچھ بھول گئے ہو؟

میں بت بنا ایلورا کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ایسے جنم کی باتیں سن رہی تھی جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ جو باتیں میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ آج اُس نے اپنے آپ شروع کر دی تھیں۔ میں حیران بھی ہو رہا تھا اور دلچسپی بھی لے رہا تھا۔ کیا یہ بھل روڈ پر رہنے والی سانولے سلونے رنگ کی مدراسی لڑکی ٹھیک سمجھ رہی ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ مجھے پچھلے جنم کی، اگر کوئی پچھلا جنم بھی ہوتا ہے، ایک بات بھی یاد نہیں آرہی تھی۔ پھر بھی یہ موضوع بڑا رومانٹک تھا اور اس نے ایلورا کی شخصیت کو میرے لیے مزید پُر اسرار بنا دیا تھا۔ وہ مجھے پہلے سے زیادہ دلکش اور اسرار خیز معلوم ہونے لگی تھی۔ اُس کی آنکھیں زیادہ روشن اور گہری ہو گئی تھیں اور ماتھے کی سرخ بندیا گویا ایک چراغ تھا جو ہزاروں سال پرانے کسی مندر کے شکستہ استھان میں جل رہا ہو۔ وہ بولے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ چہرے پر سکون تھا اور دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ تمام رکھا تھا۔

"اور اس سے بھی پہلے۔۔۔۔۔ بہت پہلے۔۔۔۔۔ ہزاروں برس پہلے ہم کوہ ہمالیہ کی ترائی کے جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔ میں تمہاری ہرنی تھی اور تم میرے ہرن تھے۔ ہمارا ایک ہی بچہ تھا۔ میں نے مہو کی جھاڑیوں میں ٹھنڈے ٹھنڈے گج میں تمہارے اس بچے کو جنم دیا تھا۔ ہم تینوں بڑی، ہنسی خوشی زندگی بس کر رہے تھے۔ کہ اچانک ایک روز کسی شکاری نے تمہیں پکڑ لیا۔ ایک تیر تمہارے شانے میں لگا اور تم زخمی ہو کر گر پڑے۔ وہ شاکر تمہیں لے گیا۔ میں تمہارے چپے بھاگی۔ میں نے اپنا بچہ سینے سے لگا رکھا تھا اور شکاری کی منتیں کر رہی تھی کہ اے شکاری! مجھے لے جا لیکن میرے ہرن کو چھوڑ دے۔ شکاری نے

"لہنی ایک بھی نشانی میرے پاس نہیں رکھو گی؟" ایلورا نے سلگتی آنکھیں اٹھا کر کہا۔

"میں تو شام کے وقت کسی پرانے مندر کے صحن میں چلنے والی ہوا ہوں۔ میں تمہیں کیا نشانی دے سکتی ہوں۔ تم مجھے کس طرح یاد دہ کر سکو گے؟" میں نے اُس کا ہاتھ تمام لیا۔

"اس پنکھے کی ہوا مندر کے صحن میں چلنے والی ہوا سے زیادہ تیز ہے لیکن یہ ہوا ہڈیوں کو خشک کرتی ہے اور وہ ہوا ہڈیوں میں خوشبو بن کر رچ جاتی ہے۔ میں اس ہوا کو کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔"

"پھر تمہیں نشانی کی ضرورت بھی نہیں۔ محبت میں نشانیاں وہ لیتے ہیں جنہیں بھول جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ یاد رکھنے والے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔" "کیا تم مجھے ہمیشہ یاد رکھو گی ایلورا؟"

ایلورا نے کافی کی پیالی طشت میں رکھ کر دھال ہونٹوں سے گالا لیا اور خاموش ہو کر سامنے پردہ سیمیں کو دیکھنے لگی۔ میں نے جب اپنی بات پھر دہرائی تو اس نے بڑی دردمند لگا ہوں سے مجھے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے سمندر کنارے کی کوئی سیاہ چٹان مجھے دیکھ رہی ہو۔ اُس کی خمور ضربتی آنکھوں میں مندر کی منڈیر پر چلنے والے دیسے جل رہے تھے۔ پتلی سی تیگی ناک ایک بھر پور عزم کے ساتھ اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر یوں تھوڑا سا سر جھکایا جس طرح ہندو عورتیں مندروں میں دیوتاؤں کے سامنے پوجا کے وقت کیا کرتی ہیں۔ پھر دھیسے سے شیریں لہجے میں بولی۔

"میں تب نہ تمہیں بھلا سکی جب ابھی تم مجھے ملے نہیں تھے۔ جب تم نے مجھے دیکھا تک نہیں تھا۔ اب کیسے بھلا سکتی ہوں۔ اب تو تم مجھے مل گئے ہو میں تو اندر ہی اندر تمہیں یاد کرتی رہی ہوں۔ راستوں پر کھڑی تمہاری راہ نکلتی رہی ہوں۔ حالانکہ تم نے پھر آنے کا وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔ یہ میری محبت ہی ہے جو تمہیں پھر سے کھینچ لاتی ہے۔ تم تو مجھے بھلا بیٹھے تھے۔ تمہیں تو مجھے دیکھ کر کچھ بھی یاد نہیں آیا۔ تمہارا یادوں کا سمندر کیسے خشک ہو گیا؟ کیا تمہیں وہ لڑکی یاد نہیں، جو آج سے سو سال پہلے دریائے گومتی کے کنارے ایک مجموعہ نمٹی کے باہر تمہارا انتظار کیا کرتی تھی؟ تم کھیتوں میں کام کیا کرتے تھے۔ بارش کے پانی سے

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری بیٹی بنی ضرور وہیں کہیں زندہ ہوگی۔"
ایلوورا نے جھٹ جواب دیا۔

"ضرور زندہ ہوگی۔ میرا تو پختہ ایمان ہے۔ اگر ہم تلاش کرنے نکلیں تو اپنی بیٹی کا نہیں تو اس کی اولاد کا سراغ ضرور مل جائے گا لیکن کتابیں ہمیں ایسا کرنے سے منع کرتی ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ہمیں صرف پچھلے جنم کے اپنے اور اپنے پتی یا بیوی کے روپ سے سروکار ہونا چاہیے اور کسی سے نہیں۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں پہچان لیا تھا۔ اور صرف تم ہی کو یاد رکھا تھا۔ کیا تمہیں اب بھی یاد نہیں آ رہی؟"
میں نے کہا!

"بالکل نہیں! ایلورا! میں داغ پر جتنا بھی زور ڈالتا ہوں۔ مجھے سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے تو اپنی بچپن کی بھی شکل ٹھیک سے یاد نہیں ہے پھر میں اُس سے بھی پہلے کا حلیہ کیسے یاد رکھ سکتا ہوں۔ تعجب ہے تمہیں ایک ایک بات یاد ہے۔"
"میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ یہ تو میری ساری زندگی کا نمونہ ہے۔ عورت سب کو بھلا سکتی ہے مگر اُسے نہیں بھلا سکتی جس سے اُس نے دل سے محبت کی ہو اور جس نے اس کی گود میں چاند سا بچہ دیا ہو۔"

اتنا کہہ کر وہ خود ہی فرما سی گئی اور آنکھیں جھپکا کر چپ ہو گئی۔ جانے کب سے فلم شروع ہو چکی تھی۔ پردہ سیمیں پر ایک آدمی گھوڑے پر کسی لڑکی کو بٹھلائے سرےٹ گھوڑا دوڑائے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ لڑکی ٹانگیں چلا رہی تھی۔ مگر اس شخص پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ بال میں لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ سینما ہال کی چمت پر کسی وقت بارش کا شور گونج اٹھتا اور کسی وقت پھر جیسے کہیں معدوم ہو جاتا۔ میں نے ایلورا کا چہرہ ہاتھ سے اوپر اٹھایا۔
"کیا تمہیں یقین ہے کہ میں نے تمہیں چاند سا بچہ دیا تھا؟"

ایلوورا نے جواب دینے کی بجائے آہستہ سے سر ہلایا اور آنکھیں بند کر کے گھر اسانس لیا۔ میرے بدن پر ایک لگی سی طاری ہو گئی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ایک کنواری لڑکی جسے آپ نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ جس سے آپ پہلے کبھی نہ ملے ہوں۔ اچانک آپ سے ملے اور کہے کہ آپ اُس کے بچے کے باپ ہیں۔ وہ بچہ جو عرصہ ہوا مر کھپ گیا ہے اور جو انسان کے بجائے ایک ہرن تھا۔ یہ سارا کچھ مجھے یونانی دیوالا کا ایک حصہ معلوم ہونے لگا جس میں انسان پھرٹا بن جاتا ہے اور دیویوں کے جل پریاں پیدا ہوتی ہیں۔

تمہیں رہا نہ کیا۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں بیچ پر ہوٹل کے باہر بیٹھے ہوئے ہرنی کا ایک گیت سنایا تھا۔ وہ گیت بچپن ہی سے مجھے اذہر ہے۔ وہ میری ہی درد بھری کہانی ہے۔ شکاری تمہیں لے گیا۔ اُس نے مجھے بھی گھائل کر دیا۔ اس کے بعد تمہارا پیارا اکھڑا دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ میں زخمی جسم لیے بچے کو سینے سے لگانے اکیلی جنگل میں پھرتی رہی اور تمہیں پکارتی رہی۔ مگر تم کہیں نہ مل سکے۔ ایک روز میں نے اپنے بھول کو جی بھر کر پیار کیا۔ ایک چٹنے پر اکیلا چھوڑا اور خود وہاں سے چل کر درختوں کے جھنڈ میں آ گئی۔ وہ میرا دم رتی پر اُس جسم کا آخری دن تھا۔ میں اپنے بچے کے سامنے نہیں مرنے چاہتی تھی۔ میں اس کی معصوم آنکھوں میں اپنی موت کا عکس نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں مر گئی اور میرا بچہ چٹنے کے کنارے اکیلا اکھڑا میرا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے ہرن کو دوسرے جنم میں پالیا لیکن میرا بچہ مجھے پھر نہیں مل سکا۔ شاید اس جنم میں اس کے بھی درشن ہو جائیں۔ میرا ہرن مل گیا ہے۔ تو مجھے میرا بچہ بھی مل جائے گا۔"

میں نے سوچا کہیں ایلورا دیوانی تو نہیں ہو گئی؟ یہ انسانوں سے چل کر جانوروں پر کیوں آ گئی۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے انسانی جنم کا تو قائل ہو سکتا تھا۔ لیکن جانور کے روپ کو قبول کرنا تو مجھے کسی حالت میں بھی گورا نہیں تھا۔ میں نے کہا۔
"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو ایلورا؟ کیا انسان جانور بھی بن سکتا ہے؟"
ایلوورا نے پلکیں جھپکا کر کہا۔

"کیوں نہیں؟ جانور بھی تو انسان کی طرح ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ تو زیادہ بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ ان کے بھولپن کا مقابلہ تو انسان کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ اور پھر کتابوں میں لکھا ہے کہ ہمارے بگوان بدھ ایک بار شیرنی کے روپ میں دنیا میں آئے تھے۔ انہوں نے شیرنی بن کر کسی کو کچھ نہیں کہا تھا۔"

میں نے کہا

"لیکن تمہیں اپنے پچھلے جنم کی ساری باتیں کیسے یاد ہیں؟"

"مجھے تو ایک بات بھی نہیں بھولی۔ اگر تم گوشتی کنارے میرے ساتھ چلو تو میں تمہیں وہ گاؤں بھی بتا دوں گی جہاں ہماری جمنو پڑی ہو کر تھی اور جہاں میں تمہارے لیے مرچیں پیدا کرتی تھی۔"
میں نے سوچ کر کہا۔

ہم سینما ہال سے باہر نکلے تو سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

ایلورا کی پیازنی ساڑھی کا پلو پٹ پٹا رہا تھا جسے وہ بار بار سنہال رہی تھی۔ آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا جن میں سے دن کی ہلکی ہلکی روشنی اپنی آخری جھلک دکھاتے ہوئے شام کے اداس اندھیروں سے دست و گربان ہو رہی تھی۔ میں نے ایلورا کی طرف نظر بھر کے دیکھا۔ وہ مجھے اب ایک دوسری عورت معلوم ہو رہی تھی۔ زندہ، صحت مند اور اس جدید ساتھی دور کی جاگتی عورت۔۔۔۔۔ جیسے پچھلے جنم کی بھول بھلیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک بدستور تھی۔ اس چمک میں ماضی کے ان گنت روحانی دور جھلک رہے تھے۔ میں اسے گاڑی میں بٹلا کر اس کی سہیلی کے گھر تک چھوڑنے آیا۔ گاڑی میں ایلورا خاموش بیٹھی رہی۔ اُس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ جب اس کی سہیلی کا گھر آگیا تو میں نے پوچھا۔

"پھر کب ملو گی ایلورا؟"

ایلورا نے دھیرے سے کہا۔

"اگلے منگل وار کو۔"

"اس سے پہلے نہیں؟"

"نہیں"

"اگر ملنا جاہو تو فون کر لینا۔"

میں نے اُسے اپنے فون کا نمبر دیا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پر نام کیا اور گاڑی میں سے نکل کر اُس بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ گئی جہاں اُس کی سہیلی رہتی تھی۔ میں نے گاڑی سمندر کے کنارے جا کر چھوڑ دی۔ اس رات میں کتنی دیر تک سمندر کے کنارے گھومتا پھرتا رہا۔ مجھے بار بار ایلورا کی محیر العقول باتوں کا خیال آ رہا تھا۔ کیا واقعی میں کسی پچھلے جنم میں ہرل رہ چکا ہوں اور پھر اس کے بعد کے جنم میں ایلورا کا خاوند رہ چکا ہوں۔ اور میری ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام بنسی تھا؟ کتنی عجیب بات ہے۔ کتنا عجیب ذہنی تجربہ ہے۔

میں رات گئے گھر واپس آیا

رات کوئی ساڑھے بارہ بج رہے ہوں گے میں نے کھانا بھی باہر ہی کھا لیا تھا۔ اولس پیلس کے گیٹ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مسز جونز برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز ہے۔ سامنے میز پر شراب کی بوتل اور ایک گلاس پڑا ہے۔ کوٹنے والا سرخ بلب جل رہا ہے۔ مسز جونز رومن کینتھوک تھی۔ وہ کوٹنے میں یسوع مسیح کے چھوٹے سے بت کے آگے سرخ بلب ساری رات جلائے رکھتی۔ میرے قدموں کی آواز سن کر اس نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں خمور ہو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ میں رک گیا۔

"ہیلو مسز جونز۔"

وہ ذرا سا مسکرائی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"تم بڑے ونڈر فل ہو مشروسی! سگریٹ ہیں تمہارے پاس؟"

میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ مسز جونز نے سگریٹ سٹکایا۔ میں نے دوسرے لوگوں کا پوچھا کہ آج وہ کہاں ہیں۔ مسز جونز نے نفرت سے سر مار کر کہا۔

"سب مر گئے۔ سب نامرد ہیں۔ سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ میں اکیلی رہ جاتی ہوں۔۔۔۔۔ تم بیٹھو گے نہیں مشروسی؟"

میں پہلے ہی پڑا اداس تھا اور نیند کو سوں دور تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پیو گے؟"

"صرف ایک پیگ۔"

مسز جونز نے بڑی خوشی کے ساتھ میرے لیے ایک ڈبل پیگ بنا دیا۔ آج وہ سکاچ و سکی پی رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی بڑی بہن کی سالگرہ تھی۔ سب لوگ وہیں گئے ہوتے ہیں۔

"گھر میں سوائے میرے اور کوئی بھی نہیں۔ میں تو اپنی بوتل اٹھا کر چلی آئی۔ آخر سالگرہوں میں رکھا کیا ہے؟ اب دیکھو میری عمر چالیس کے قریب ہے۔ لیکن میں نے کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی۔ مجھے تو ایسی باتوں سے نفرت ہے۔"

میں نے گلاس حلق میں اندھیل کر پوچھا۔

"وہ لوگ کب آئیں گے؟"

سرسز جونس نے سر ہلا کر کہا۔

"کبھی صبح واپس ہوں گے۔ سچے بھی دہیں ہیں۔ انہوں نے انگریزی بینڈ ہاؤس منگو رکھا تھا۔ عجیب اوٹ پٹانگ گانے بجا رہا تھا۔ میرے تو سر میں درد ہونے لگا۔ اور دول؟"

"نہیں بس کافی ہے۔"

"تم تو ایسا نہ کہو۔ تم تو مرد ہو۔ میرا خاوند تو نامرد ہے۔ بالکل نامرد۔ وہ پیگ پی کر ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ مجھے تم اسی لیے پسند ہو کہ تم مرد ہو۔ پورے مرد۔"

اُس نے کھکھلا کر ایک قہقہہ لایا اور میرے لیے دوسرا ڈبل تیار کر دیا۔ میں نے چارو ناچار اپنی مردانگی کی عزت رکھنے کی خاطر پی لیا۔ اب باقاعدہ شراب کا دور چل پڑا۔ کوئی پاؤ بھر بوتل سرسز جونس پیٹے ہی پی گئی تھی۔ اب جو مزید دو ایک پیگ اور پئے تو وہ نشے میں ہو گئی اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔ میں نے بوتل میں کارک لگا کر اُسے میز کے نیچے رکھ دیا۔ سرسز جونس نے لاکھ شور مچایا مگر میں نے بوتل دینے سے انکار کر دیا۔ سگریٹ اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اُس نے گون کا دامن جھٹک دیا۔ اس کی ٹانگیں اوپر تنگی ہو گئیں۔ میں نے آنکھیں دوسری طرف کر لیں۔ حسب عادت اُس عورت نے نیچے کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو کر چڑھ سی گئی تھیں۔ اس کا سر پوری طرح کھڑا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اُسے دانتیں باتیں مار رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تمام کر کہا۔

"سرسز جونس اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ آؤ میں تمہیں خواب گاہ میں چھوڑ آؤں؟"

سرسز جونس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مسکرا کر بولی۔

"ونڈرفل بوائے۔۔۔۔۔ مائی پریٹی بوائے۔۔۔۔۔"

وہ میرا بازو تھامے، میرے کندھے پر جھکی۔ (کھڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ خواب گاہ کی طرف چل پڑی۔ ہال کمرے میں دھیمی سی روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی عتقی برآمدے کی، بتی سے اندر آرہی تھی۔ میں پردہ اٹھا کر اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اندر اندھیرا تھا۔ سرسز جونس نے میرے گلے میں دونوں بازو ڈال کر کہا۔

"دروازے کے ساتھ بتی کا بیٹن ہے۔"

میں نے بیٹن دبایا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ میں اُسے بڑی مشکل سے قدم قدم چلاتا اُس کے

پلنگ تک لایا۔ اس کا پلنگ بہت بڑا تھا اور وہاں سبز رنگ کا ایک کھبل پڑا تھا۔ جس کا رنگ مٹیالا ہو رہا تھا۔ کمرے کی فصائیں سے اُبلتی ہوئی گاجروں کی بُو آ رہی تھی۔ میں نے سرسز جونس کو پلنگ پر ڈال دیا۔ وہ جانے کیوں مجھ سے لپٹتی جا رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی چھاتیاں سرہانوں کی طرح میرے جسم سے لگ کر دبی جا رہی تھیں۔ اس کا سارا جسم ہی ایک بڑا سرہانہ تھا۔ میرے حواس باختہ ہو رہے تھے۔ نشہ نصف ہرن ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے بستر پر لٹا کر کہا۔

"شب بخیر۔"

"نہیں مسٹر وصی!۔۔۔۔۔ تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں ڈرتی ہوں۔ دیکھو۔ دیکھو رات کالی ہے۔ ڈراؤنی ہے۔ اور بارش۔۔۔۔۔ باہر بارش ہونے لگی۔ اے اللہ! میں خود کشی کر لوں گی۔ اکیلی خود کشی کر لوں گی۔۔۔۔۔ مسٹر وصی! تم۔۔۔۔۔ تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟ مسٹر وصی نہیں نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ بارش۔۔۔۔۔ مسٹر وصی پلیز۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ میں اکیلی عورت ہوں۔۔۔۔۔ کوئی میرا نہیں۔۔۔۔۔ میرا خاوند نامرد ہے۔ میرے سچے اُس کے نہیں۔ یہ اُس کے نہیں۔۔۔۔۔ ایک بچہ اس کانے کا ہے۔ اور دوسرا۔۔۔۔۔ اخ تھو۔۔۔۔۔ ڈرٹی!۔۔۔۔۔ ڈرٹی۔۔۔۔۔ مسٹر وصی۔۔۔۔۔"

واقعی باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔ چمت پر بارش کا شور بلند ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر بڑے زوروں کا ہینڈ شروع ہو گیا تھا۔ نشے کے عالم میں سرسز جونس کے منہ سے نکلی ہوئی باتیں سُن کر میں ہکا بکا ہو رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ لیکن اُسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ شراب پی کر عورت۔۔۔۔۔ خاص کر عورت کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اب میں وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ مجھے وہاں سے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن سرسز جونس میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور مجھے پلنگ پر بٹھلائے شراب میں دھت اوٹ پٹانگ باتیں سنارہی تھی۔ نشہ مجھے بھی ہو رہا تھا۔ مگر میں اپنے حواس میں تھا اور دوسرے مجھے نیند بھی آ رہی تھی۔ جب میں نے اُسے سلائے کی کوشش کی تو اُس نے لجاجت سے کہا۔

"تھوڑی سی شراب اور پلاڈو مسٹر وصی۔۔۔۔۔ پریٹی بوائے بس ایک جام اور پلاڈو۔"

پھر میں سو جاؤں گی۔"

جب اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ ایک ہام پی کر سو جائے گی۔ تو میں نے اسے تعویذ سی شراب اور پلا دی۔ شراب پی کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں دبے پاؤں کمرے سے باہر آ گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے اندر سے چٹنی لگائی۔ کپڑے اتار کر شب خوابی کا لباس پہنا اور بتی بجھا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ باہر بارش بڑے زوروں کی ہو رہی تھی۔ ہوا درختوں میں سے چٹنی ہوئی گزر رہی تھی۔ بارش کے بھیٹے سمندر کی لہروں کی طرح۔۔۔۔۔ کوٹھی کی دیواروں سے گنگا رہے تھے۔ میزے کمرے کی صرف ایک کھڑکی کھلی تھی۔ جس میں سے تیز اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔ ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ میں نے چادر اوپر کر لی اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلے میں گل زنب اور ثریا کے ہارے میں سوچتا رہا۔ ثریا اچھی صحت مند گول مٹول سی ہرے ہرے سینے والی لڑکی تھی۔ اگر اس سے بھی عشق کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ پھر ایلورا کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کا گھر اسانولا ہندی چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس کی پراسرار باتیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ مجھے اس خیال سے بڑی سنسنی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو میری بیوی سمجھ رہی ہے۔ میں نے سوچا اگر میں اس کا خاوند ہوں تو وہ پھر مجھ سے دور دور کیوں ہے؟ اسے تو اس وقت میری خواب گاہ میں میرے پاس ہونا چاہیے تھا۔ میرا سر پکڑنے لگا۔ میں نے ایک گلاس پانی کا پیلا اور پلنگ پر دوبارہ لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ شاید مجھے نیند آگئی۔ کیونکہ پھر میرے کانوں میں بارش کی آواز بھکی ہو گئی تھی۔ جانے میں کتنی در اس نیم خوابی کے عالم میں پڑا رہا ہوں گا کہ اچانک دروازے پر بار بار دستک دینے کی آوازوں نے مجھے جگا دیا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

مجھے یوں لگا جیسے ایلورا باہر کھڑی دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ کیونکہ میں اس سے پہلے خیال ہی خیال میں ایلورا سے باتیں کر رہا تھا اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

میں نے اسی عالم میں اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور اس کے ساتھ ہی مسز جونز آتے ہی میرے پلنگ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ باندھ کر بولی۔

"خدا کے لیے مجھے بھلا لو وصی! میں خود کشی کر لوں گی۔ میں مر جاؤں گی۔ میرے کمرے

میں بھوت رہتا ہے۔ وہ کلہاڑا لے کر وہاں کھڑا ہے۔ میں مر جاؤں گی۔ میں اپنے کمرے میں لیکے نہیں جاؤں گی۔ خدا کے لیے مسٹر وصی۔۔۔۔۔"

میری جان عجیب مصیبت میں آگئی تھی۔ میں نے اسے مراعی میں سے پانی پلایا۔ سگریٹ جلا کر دیا۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ اس کے کمرے میں کوئی بھوت نہیں رہتا۔ لیکن مسز جونز تو پاگل ہو رہی تھی۔

"اگر تم اتنے سنگدل ہو کہ مجھے ہلاک کروانا چاہتے ہو تو میں یہاں سے نکل جاؤں گی۔ کو لمبو کی سرنگوں پر ننگی پھرنا شروع کر دوں گی۔ پھر تم سب لوگوں کو ہوش آجائے گا۔ میں تھے میں نہیں ہوں۔ اچھا تم میرے ساتھ چلو۔ چل کر اس بھوت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔۔۔۔۔ چلو میرے ساتھ۔"

میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ کسی طرح سے وہاں سے نکلے۔ چنانچہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک بار پھر لے کر اس کی خواب گاہ کی طرف چل پڑا۔ اس کی خواب گاہ کا دروازہ کھلا تھا اور اندر اندر اندھیرا چھا رہا تھا۔ عقبی باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں بارش کا زبردست شور اور ٹھنڈی بارش میں بھیگی ہوئی ہوا اندر آرہی تھی۔ خواب گاہ میں آ کر مسز جونز مجھ سے لپٹ گئی اور پلنگ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"وہ دیکھو۔ وہ ہے بھوت۔۔۔۔۔ دیکھو وہ میرے پلنگ پر لیٹا مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں اس پلنگ پر نہیں لیٹوں گی۔ میں اکیلی نہیں لیٹوں گی۔ مسٹر وصی! یہ بھوت مجھے مار ڈالے گا۔۔۔۔۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔"

میں بڑے جھمبے میں پھنس گیا تھا۔ نیند جیسے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ سر درد کرنے لگا تھا۔ دوسری جانب مسز جونز کا گرم گرم پنہ اور تجربہ کار جسم میرے ساتھ لگا ہوا تھا اور میرا ضمیر بڑی شدید کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس نے مجھے پاگلوں کی طرح کھینچ لیا اور میرا منہ چومنے لگی۔ میں نے اسے چمبے کیا۔ سگریٹ میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ میں نے اسے پاؤں تلے مسل دیا۔ مسز جونز نے دروازہ بند کر کے چٹنی لگا دی۔

"تم مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ نہیں جاسکتے۔ میں اکیلی ہوں۔ کئی سالوں سے اکیلی ہوں۔ مجھے کبھی کسی مرد کا لمس نصیب نہیں ہوا۔ میں بھی عورت ہوں اور عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں ایک عورت کو مرد کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میرے

پاس کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔۔۔۔۔ وہ کا ناب میرے پاس نہیں آتا۔ کہتا ہے کہ میرے جسم سے گھوٹے کے پسینے کی بو آتی ہے۔ کیا میرا جسم ایسا ہے وصی! سچ سچ کہو۔ کیا میرے جسم سے بو آتی ہے؟ نہیں نہیں۔ اگر آتی بھی ہے تو میں کیا کروں۔ میں عورت ہوں۔ عورت۔۔۔۔۔ جس کا خاوند نامرد ہے۔ جو مجھے چوم کر چھوڑ جاتا ہے۔ میرے جسم میں آگ لگا کر چلا جاتا ہے۔ میں شراب پی کر پاگل ہو جاتی ہوں۔ نئے میں چور ہو کر بستر پر گر پڑتی ہوں۔ شاید نوند آجائے۔ مگر نوند بالکل نہیں آتی۔ عورت کی نوند مرد کے طاقتور جسم میں ہے۔ شراب میں نہیں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کیا میں ٹیکسی بن جاؤں؟ میں ایسا بھی تو نہیں کر سکتی۔ میں جائن داد والی ہوں۔ تم کہو تو میں ایک کوٹھی مفت دے دیتی ہوں۔ تم چاہے عمر بھر وہاں رہو۔ میں تم سے ایک پانی بھی کرایہ وصول نہیں کروں گی۔۔۔۔۔ میں تمہیں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔ کیونکہ تم مرد ہو۔ پورے مرد ہو۔ میں تمہارے جسم کی طاقت کو محسوس کر رہی ہوں۔ کیا تم مجھے اسی طرح تڑپتا چھوڑ کر جاؤ گے؟ کیا تم بھی سنگدل ہو؟ میرے خاوند کی طرح؟ بولو مسٹر وصی؟

میں سنگدلت جلا کر خواہ گاہ کے فرش پر چکر لگانے لگا۔ پھر میں کھرکی کے پاس باغ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ بارش بڑی تیز ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار میرے ماتھے پر پڑنے لگی۔ میرا جسم گرم ہو کر سنت بستر کی طرح ہو گیا۔ آنکھیں اور ہاتھ کی انگلیاں جلنے لگیں۔ منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا۔ خواہ گاہ میں اندھیرا تھا۔ باہر باغ میں اندھیرا تھا۔ اور تیز بارش کے شور کے سوا وہاں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مسز جونز پیچھے سے آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بالکل عریاں تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی ایک گھنٹے بعد جب میں اس کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو مسز جونز اپنے پلنگ پر منہ کھولے بے سدھ ہو کر سو رہی تھی۔ اس سہجے کی طرح جس نے خوب سیر ہو کر دودھ پی لیا ہو۔ بارش ہلکی ہو گئی۔ بادل بدستور گرج رہا تھا اور بجلی بھی چمک رہی تھی۔ میں نے خواب گاہ کا دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

صبح در سے اٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرنے ہال کمرے میں آیا تو مسز جونز میرے لیے ٹوسٹ بنا رہی تھی۔ میری آنکھیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر مسز جونز کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ روز کی طرح مسکرا رہی تھی اور بڑی ہنس ہنس کر مجھ سے

باتیں کر رہی تھی۔ اس کا خاوند اور سہجے ابھی تک نہیں آئے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھا کر آئیں گے۔ پھر میرے لئے چائے بنا کر بولی۔

"رات بڑی بارش ہوئی۔ میں تو باہر برآمدے میں بیٹھی شراب پی رہی تھی۔ مجھے اندر کون لے گیا؟ کیا تم مجھے سلائے آئے تھے؟ ارے مجھے تو کچھ بھی ہوش نہیں۔" میں نے شکر کیا کہ اسے کچھ خبر نہیں۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ لیکن پھر وہ مسکرا کر میری طرف کنکھیں سے دیکھ کر بولی۔

"تم بڑے اچھے ہو پڑی ہو انے۔۔۔۔۔ اگر تم میری دلبوئی نہ کرتے تو رات میں نے خود کشی کر لی تھی۔ تم واقعی بڑے زبردست مرد ہو۔ میں نے تو تم ایسا مرد آج تک نہیں دیکھا۔ کیا تم شراب رہے ہو؟ کیوں؟ میری عمر چھتیس سال ہی تو ہے۔ یہ کوئی زیادہ عمر تو نہیں۔۔۔۔۔ تم چاہو تو روز میری خواہ گاہ میں آ سکتے ہو۔ میں باغ والی کھرکی کھلی رکھ کر سوئی ہوں۔"

پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اس قہقہے میں زندگی کی ساری رعنائیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس عورت کا قہقہہ زندگی سے کس قدر بھرپور اور کنواری لڑکیوں ایسا تھا! اس قہقہے کے ساتھ جب مجھے خیال آیا کہ یہ عورت کل رات میرے ساتھ ایک ہی پلنگ پر سو رہی تھی۔ تو مجھے بالکل ندامت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن یہ تو ہر رات خواہ گاہ کی کھرکی کھلی رکھنے والی بات تھی۔ اس سے مجھے خوف محسوس ہوا۔ میں نے جبر جبری لی اور چائے حلق میں ڈال کر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دفتر پہنچا تو وہاں ایک نیا گل کھلا ہوا تھا۔

معلوم ہوا کہ دفتر کی سٹینوس روتھ جتنے حوالدار پیارا سنگھ سے شادی کا اعلان کر دیا ہے۔ دفتر میں سب کے نام دعوت نامے آئے ہوئے تھے۔ یہ دعوت نامے پیارا سنگھ نے بڑے پیسے خرچ کر کے کولمبو کے اعلیٰ ترین پریس سے چھپوائے تھے۔ روتھ نے دفتر سے چھٹی کر رکھی تھی۔ کیونکہ دو بچے سول کورٹ میں اس کی شادی ہونے والی تھی۔ حوالدار پیارا سنگھ دفتر آیا ہوا تھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اور بار بار ہر ایک سے ہاتھ مل رہا تھا۔ جب اس نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا تو میں نے پوچھا۔

"ویسے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے پیارا سنگھ۔ مگر تمہاری پہلی بیوی کا کیا بنے گا؟

کیا وہ ایک سو کن برداشت کر لے گی۔"

پیارا سنگھ آنکھ مار کر بولا۔

"بادشاہو! پہلے کبھی کھالیں۔ پھر سوچیں گے کہ یہ بچے گا بھی یا نہیں۔"

مگر پیارا سنگھ تمہارے مذہب میں تو دوسری شادی نہیں کی جاتی۔"

"بادشاہو! میم میم ہوتی ہے۔ کلونت کور کو اس کے گھر بھیج دوں گا۔ اب تو میرے سچے انگریز ہوں گے۔ اور پھر یہی بات تو یہ ہے کہ میں روتھ سے پریم کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ ہم دونوں سوچ سمجھ کر شادی کر رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا تم اسے واپس گاؤں لے جاؤ گے؟"

"کیوں نہیں؟"

"وہ تمہارے گاؤں میں رہ لے گی؟"

"بادشاہو! میں نے اس سے ساری بات کر لی ہے۔ وہ ہمارے گاؤں کی لسی پے گی تو اسے ہوش آجائے گی۔ کھتی ہے کہ میں تمہارے ساتھ جیل میں بھی رہ سکتی ہوں۔ پریم بڑی شے ہوتی ہے بابو۔"

میں جانتا تھا کہ روتھ پیارا سنگھ کے ساتھ جیل میں تو رہ سکتی ہے۔ لیکن اس کے گاؤں میں دو روز بھی نہیں رہ سکتی۔ لیکن میں ان کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں شادی کے بعد زیادہ خوش رہیں۔ اور ہر بات کو ہنسی خوشی برداشت کرتے چلے جائیں۔ پیارا سنگھ نے بتایا کہ شادی کے بعد وہ گیریزن سے اٹھ کر روتھ کے پاس چلا جائے گا۔ اس نے اس کی میز صاحب سے اجازت لے لی تھی۔

دوپہر کو ہمارے دفتر کا سارا عملہ عدالت میں پہنچ گیا۔ روتھ کے کچھ دوسرے دوست بھی آئے ہوئے تھے۔ اس نے سفید شیٹوں کا شادی والا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اور ہاتھ میں گلدستہ تھامے ہوئے تھی۔ پیارا سنگھ نے سوٹ پہن رکھا تھا۔ گرمی کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ شادی ہو گئی۔ سب دوستوں کی مبارکبادوں کے شور اور ہنسی مذاق کے قہقہوں میں وہ لوگ گاڑی میں سوار ہو کر گال مینس ہوٹل میں آ گئے۔ یہاں شام کو ایک پر تکلف دعوت دی گئی۔ کھانے کے بعد پیارا سنگھ اور روتھ نے ہم سب سے مسکرا مسکرا کر ہاتھ ملایا اور اپنے

گھر کو روانہ ہو گئے۔ دوسرے روز دونوں میاں بیوی ہنسی منانے کو لمبو سے دور کاندھنی چلے گئے۔

شام کو میں نے اولس ہیلس والوں کو آکر اس شادی کی خبر سنائی تو مسٹر جونس نے بڑا افسوس ظاہر کیا کہ ایک اچھی خاصی امریکی عورت ایک سکھ کے پلے پڑ گئی۔ یہ لوگ لان میں بیٹھ کر حسب عادت بیر پی رہے تھے۔ مسٹر جونس نے خبر سن کر کہا۔

"میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ دونوں کبھی خوش نہیں رہیں گے۔ امریکی عورت کبھی کسی ہندوستانی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دونوں کے کلچر جدا ہیں۔ ہر چیز جدا ہے۔"

مسٹر جونس نے بیر کا گلاس پی کر کہا۔

"یہ سب بکواس ہے۔ کلچر، ملک، طبیعت۔۔۔ سب بکواس ہے۔ عورت کو صرف مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جتنا کوئی زیادہ مرد ہوگا۔ اتنی در عورت اس کے پاس رہے گی۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک ہی ملک میں رہنے والوں میں کبھی طلاقیں نہ ہوں۔"

مسٹر جونس خاموش ہو گئے اور بڑی تیزی سے بیر کا گلاس چڑھا گئے۔ اس شخص کا چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا اور ٹھڈی نیچے کو ٹٹک گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس رات مسٹر جونس نے اپنے خاوند کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ بالکل سچ تھیں۔ میں مسٹر جونس کے پاس والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور اُن میں شام کا اندھیرا اتر آیا تھا۔ مسٹر جونس نے میرے گلاس میں بیر ڈالتے ہوئے اپنا پاؤں میرے پاؤں سے دبایا اور مسکرا دی۔ سامنے کا ناشتہ بیٹھا اپنی دیسی خراب پئے جا رہا تھا اور ہماری باتوں سے بالکل بے خبر تھا اور بار بار کوٹھی کے گیٹ کی طرف دیکھ لیتا تھا جہاں اسے امید تھی کہ اس کی بطن ایسی محبوبہ آئے گی۔ مسٹر جونس کے دونوں بچے سامنے والی کوٹھی کے عقبی باغ میں کھیل رہے تھے۔ ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ہوا بند تھی اور شام گرم ہو رہی تھی۔ لان میں بیٹھے ہمیں پھر کاٹ رہے تھے۔ بیر کے چوتھے گلاس کے بعد پھر کے ڈنگ میرے جسم پر بے اثر ہو گئے۔ اتنے میں برآمدے میں بڑے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ مسٹر جونس ننگے پاؤں دوڑ کر فون کے پاس گئی۔ پھر مسکراتی ہوئی میرے پاس آ کر بولی۔

"مسٹر وھی! تمہارا فون ہے۔ کوئی لڑکی بول رہی ہے۔"

"اچھا! تو گویا تم یہ جانتی ہو کہ کچھ پیا بھی جاتا ہے۔ میں نہ کھتا تھا کہ تم جنگل کا پھول ہو۔ تم واقعی جنگل کا پھول ہو۔ اگر پھول نہیں تو جنگل ضرور ہو۔ اور اگر جنگل بھی نہیں تو بیسر کی بند بوتل ضرور ہو۔"

اولس پولیس والوں کی منڈلی لان میں پیٹے کے درخت کے نیچے ابھی تک بیٹھی شراب

پنی رہی تھی۔ مسٹر جونس نے ٹانگیں میز پر بچا رکھی تھیں۔ کانے عاشق کی محبوبہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اور اس کی گردن طوطے کی طرح ہل رہی تھی۔ مسز جونس نے مجھے دیکھا تو اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ اور ساتھ والی آرام کرسی پر آکر نیم دراز ہو گئی۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ اور بالوں کا جوڑا گردن پر کس کر باندھا ہوا تھا۔ میں سرور میں تھا۔ دل صبح ثریا سے، ایک جوان صحت مند پنچابی لڑکی سے ملنے کے خیال سے سرور تھا۔ اس وقت مجھے مسز جونس کا سنبیدہ چہرہ ایک آنکھ نہ بجایا۔ میں یونی موسم کی بات کرنے لگا۔ مسز جونس نے اچانک کہا۔

"کیا تم مجھ سے خوش نہیں ہو؟"

میں نے پوچھا

"کس بات میں؟"

"کیا میں تمہیں خوش نہیں کر سکتی؟ میں نے تو اپنا آپ تمہارے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے تو اتنی محبت کبھی کسی سے نہیں کی جتنی تم سے کرتی ہوں۔ پھر تم دوسری لڑکیوں کے پیچھے مارے مارے کیوں پھر رہے ہو۔ اس لیے کہ میں خوبصورت نہیں ہوں۔ یا میں عمر میں تم سے بڑی ہوں؟ کاش! میں اپنی عمر ایک ہی رات میں سولہ سال کم کر سکتی۔ پھر تم مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاتے؟"

میں نے سوچا۔ لو یہ ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ اسے تو محبت کا بخار ہو گیا۔ یہ عورت کس غلط فہمی میں پھنس گئی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"مسز جونس! تم کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ اول تو میں کسی لڑکی سے محبت نہیں کرتا۔" "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم ضرور محبت کرتے ہو۔ تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم محبت کرتے ہو۔ جب تم فون کر کے آ رہے تھے تو تمہارے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جو صرف محبت کرنے والوں کے ہونٹوں پر ہی ہوتی ہے۔ میں نے ایک زمانہ دیکھا ہے۔ میں بچی تو نہیں ہوں۔ خیر! تمہیں محبت کرنے کا حق ہے۔ میں تمہیں روک نہیں سکتی۔ لیکن اتنا ضرور کہہ دوں گی کہ جو محبت تمہیں مجھ سے ملے گی وہ تمہیں دنیا کی کوئی عورت نہیں دے سکتی۔ یہ کنواری چھو کر یاں تو صرف بات بات پر ضرمانا اور ہائے والے کرنا ہی جانتی ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ مرد کو محبت کا جواب کس طرح دیا جاتا ہے۔"

مسز جونس نے سگریٹ گھاس میں پھینک دیا۔ میں نے اپنا سگریٹ پیش کیا۔ اس نے چپکے سے لے لیا۔ اور اسے جلا کر بولی۔

"تم میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہو گے۔ مگر میں حق میں بات نہیں کر رہی۔ میں تم سے پورے ہوش و حواس میں ہکلام ہوں۔ عورت تیس سال کے بعد جا کر پوری عورت بنتی ہے۔ اور میں چھتیسویں سال میں ہوں۔ میں عورت پنپنے کے عروج پر ہوں۔ میں تم پر عورت کے ایسے ایسے راز فاش کر سکتی ہوں کہ تم عمر بھر مجھے یاد کرتے رہو گے۔ میری زندگی میں کئی لوگ آئے اور چلے گئے۔ مگر تم ان سب سے پیارے ہو۔ اسی لیے میں تمہیں زیادہ پسند کرتی ہوں۔ بتاؤ کیا میں تمہیں بری لگتی ہوں؟"

میں نے کہا:

"میں یقیناً تمہیں پسند کرتا ہوں مسز جونس! تم بہت شاندار عورت ہو۔ تم ہمدرد ہو۔ رحم دل ہو اور سب سے بڑھ کر یہ دل کی انتہائی سادہ اور نیک ہو۔ بلکہ میں تو تمہاری بے حد عزت کرتا ہوں۔"

"بکواس ہے۔ مجھے عزت کی نہیں محبت کی ضرورت ہے۔ چاہے مجھے آوارہ اور حیا باختم سمجھو مگر مجھ سے محبت کرو۔ میں محبت چاہتی ہوں۔ عزت نہیں۔ عزت میری کہیں بھی نہیں ہے اور نہ مجھے کبھی مل ہی سکتی ہے۔ عورت کی عزت جب ایک بار ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔ مجھے صرف اتنا بتادو۔ کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں۔۔۔۔۔ بس۔"

میں پریشان ہو گیا۔ میرا سارا انداز غارت ہو گیا تھا۔ اس عورت نے مجھے عجیب امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اگر صاف صاف بات کہتا ہوں تو اس کی دل شکنی ہوتی ہے۔ جھوٹ بولتا ہوں تو یہ ڈراماں گیر ہے کہ کہیں یہ بلا سر پر ہی سوار نہ ہو جائے۔ آخر میں نے کہا۔

"تم سے کون محبت نہیں کرے گا مسز جونس! تم بلاشبہ بڑی اچھی عورت ہو۔"

مسز جونس نے سر جھٹک کر کہا۔

"مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں۔ تم مجھے چاہتے ہو یا نہیں؟"

"ہاں! میں بھی چاہتا ہوں۔"

اس پر مسز جونس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اگر سامنے

لان میں اس کا خاوند اور وہ کا نا عاشق نہ ہوتا تو وہ یقیناً میرا منہ چنم لیتی۔ پھر بھی اس نے میرا ہاتھ زور سے دبایا اور اٹھ کر لان میں چلی گئی۔ وہاں جا کر اس نے بیسر کا گلاس بھرا اور اسے لے کر میرے پاس آگئی۔

"میرے خوشی کی خاطر اس کا ایک گھونٹ پی جاؤ۔"

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر بیسر کا ایک گھونٹ پی لیا۔ اس کے بعد اس نے گلاس کو چھوڑا اور غٹاٹ ساری بیسر پی گئی۔ پھر جھک کر بولی۔

"تم نے مجھے بے حد خوشی دی ہے۔ میں بھی تمہیں بے حد خوشی دوں گی۔ تم جہاں بھی ہو گے۔ مجھے ضرور یاد کرو گے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ گلاس لیکر لان میں واپس آگئی۔ میز پر گلاس رکھا۔ اپنے خاوند کا بوسہ لیا۔ کانے عاشق کے سر پر ایک ہلکی سی دھپ ماری اور مورنی کی طرح ناچتی میرے پاس برآمدے میں آکر رک گئی۔ مجھ سے سگریٹ لیا۔ اسے جلانے کے لیے جھکی اور بولی۔

"ذرا میرے ساتھ آؤ۔"

پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہوئی اپنے خاوند کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میں مسٹر وحی کو کافی پلانے لگی ہوں۔ اگر تم لوگوں کو یہی ہو تو اندر آ جاؤ۔"

ہال کمرے میں جا کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔ اور پچھتاتے لگا کہ میں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑا کیوں مار دیا۔ اس نے چٹ پٹ میرا منہ چوم لیا۔ میرے گال پر اسکے منہ سے بیسر کے بھیکے اڑنے لگے۔ اس نے نو عمر لڑکیوں کی طرح فرما کر کہا۔

"کل رات میں جو نس کو باہر بھجوا رہی ہوں۔ بچے بھی اس کے ساتھ جائیں گے۔ بولو! اب تو خوش ہونا۔۔۔۔۔ کل رات میں تمہیں بتاؤں گی کہ عورت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔"

میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اتنے میں باہر سے مسٹر جو نس اور کا نا عاشق "ہم بھی کافی پئیں گے" کی گردان کرتے اندر ہال کمرے میں آکر بیٹھے اور وہاں قہقہوں اور ہنسی مذاق کے طوفان میں کافی کا دور شروع ہو گیا۔ اس دوران مسٹر جو نس بار بار مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی اور میرے چنگیاں بھرتی رہی اور میں خوف سے کانپتا رہا۔

9

گیارہ بجے کے قریب ثریا آگئی۔

میں دفتر میں پروگرام ختم کرنے کے بعد کچھ خط دیکھ رہا تھا کہ وہ دفتر میں داخل ہوئی۔ میں نے گیٹ میں کانگری کو پہلے ہی کہہ رکھا تھا۔ ثریا نے ہلکے نیلے رنگ کی پھولدار کرپ کی قمیض اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ گلے میں دوپٹ پڑا تھا۔ پاؤں میں سرخ سینڈل تھی۔ اس کا رنگ نکھر ا ہوا تھا اور ہونٹوں کے اوپر پسینے کی قطار چمک رہی تھی۔ آج گرمی تھی اور رات بھر کی بارش کے بعد پھر جس ہو گیا تھا۔ دھوپ کبھی نکل آتی اور کبھی سورج بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔ میں مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ثریا کو اپنے پاس بٹھلایا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا پیونگی؟ چائے یا ملک سکویٹ؟"

"جو آپ رات کو پی رہے تھے۔"

ثریا نے ضرارت سے مسکرا کر کہا۔ میں خفیف سا ہوا کر ہنس دیا۔ وہ اس لئے شاید بے تکلف ہو رہی تھی کہ رات میں بھی اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"رات میں تو چائے پی رہا تھا۔ کیا چائے منگواؤں؟"

ثریا ہنس پڑی اور اس کے سفید دانتوں کی لڑھی جگمگا اٹھی۔

"چائے پی کر آدمی ایسی باتیں نہیں کرتا جیسی باتیں رات آپ فون پر کر رہے تھے؟"

اب میں کچھ فکر مند ہوا کہ جانے میں نے کیا باتیں کی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

"میں نے بھلا کیا کہا تھا رات؟"

ثریا نے اپنا پرس میز پر رکھ کر مسکرا کر کہا۔

"آپ کہہ رہے تھے ثریا تم جنگل کا پھول ہو۔ تم جنگل ہو۔ تم جنگل میں مغل ہو۔ تم

ماؤنٹ ایورسٹ ہو اور خدا جانے کیا کیا ہو۔۔۔۔۔"

وہ زور سے ہنس پڑی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ دفتر کے دو ایک آدمیوں نے کنکھیں سے

ہماری طرف دیکھا اور زیر لب وہ بھی مسکرا دیئے۔ میں ثریا کو لے کر سٹوڈیو میں آگیا۔ میں

نے اسے سارے سٹوڈیو دکھلائے۔ اسے بتایا کہ ریکارڈ کیسے بجائے جاتے ہیں۔ فرانسس پروگرام کمال سے ہوتا ہے۔ ہماری آواز کیسے مائیکروفون سے ہو کر لوگوں کے ریڈیو سیٹ تک پہنچتی ہے۔ پھر میں نے اسے ساتھ والے کمرے میں ریکارڈوں کی لائبریری دکھلائی۔ اتنے سارے ریکارڈ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ میں نے اس کا تعارف امریکی اناؤنسر مس کیٹی اور مدر اسی اناؤنسر لڑکی سے کروایا۔ پورے بارہ بجے ہم دونوں دفتر کی عمارت سے باہر نکل آئے۔ میں نے اس سے کہا۔

"کیا تمہارے پاس کچھ فالٹو وقت ہے؟"

"کس لئے؟"

ثریا نے مسکرا کر پوچھا۔ میں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہا۔

"میری خواہش ہے کہ ہم دونوں کسی جگہ بیٹھ کر اگلے کھانا کھائیں۔"

ثریا نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ وصی صاحب کہ میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں دعوت کا بہانہ کر کے گھر سے آئی ہوں۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے پاس کافی وقت ہے۔ تم کم از کم پانچ بجے تک میرے پاس ٹھہر سکتی ہو۔"

"اوئی ٹنڈ! پانچ بجے تک تو شام ہو جائے گی۔ بس ایک آدھ گھنٹہ رک جاؤں گی۔ وہ بھی آپ کی خاطر۔"

ثریا نے شرمناک ہنسنا اور درختوں کو دیکھنے لگی۔ میں نے سر جھکا کر شکر یہ ادا کیا۔ اور

کانگری سے کہا کہ ہمیں جیب چاہیے۔ کانگری سہیلی فوج کا حوالدار تھا اور اس کا منہ ہمیشہ

پیسے سے بھرا ہوا رہتا تھا۔ اس نے کہا۔

"سر ٹولیو تھرٹین گیریزن گیا ہے۔ پندرہ بارہ ورکشاپ میں ہے۔ سولہ بیس میجر

صاحب کو لے کر گئی ہے۔ تھوڑا ویٹ کرنا پڑے گا۔"

"کوئی بات نہیں مسٹر کانگری ہم ٹیکسی لے لے گا۔"

"سروریری سوری! تھوڑا ویٹ کر لے گا تو ابھی گاڑی آجائے گا سر۔"

"تھینک یو مسٹر کانگری!"

میں ثریا کو ساتھ لے کر گیٹ سے باہر نکلا ہی تھا کہ سولہ بیس نمبر جیب آ گئی۔ کانگری نے مجھے آواز دی۔ میں رک گیا۔ جیب دروازے کے باہر ہی روک دی گئی۔ ہم دونوں جیب میں سوار ہو گئے۔

"گال چلو۔"

ہماری فوجی جیب کو لمبو کی کشادہ اور خوبصورت سرٹکوں پر فراٹے بھرتی گذرنے لگی۔ رات کی بارش نے سرٹک کی دونوں جانب کھڑے درختوں کو دھو دھلا کر ہرا ہرا اور شاداب کر دیا تھا۔ سرخ پھولوں کے گچھے جا بجا درختوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ ہماری جیب مختلف سرٹکوں پر سے ہوتی ہوئی گال روڈ پر آ گئی۔ ہوا میں ثریا کا دوپٹا لہرا رہا تھا۔ رخساروں پر بالوں کی لٹ اڑ رہی تھی اور کرب کی ریشمی قمیض بدن کے ساتھ چٹ گئی تھی۔ یہ لڑکی اس رات سے زیادہ تروتازہ اور شگفتہ ہو رہی تھی۔ اس شام کو جب وہ مجھے گل زنب کے گھر ملی تھی تو پھرے پر تنک کے آثار تھے۔ لیکن آج تو وہ ایک ایسے پھول سے مشابہ تھی جس نے ساری رات شبنم میں غسل کیا ہوا اور جس کی ہر پنکھڑی پر بہار کا نام لکھا ہو۔

فرسکو ریستوران کے باہر میں نے جیب کھڑی کرادی۔ گال روڈ پر فرسکو واحد ہوٹل تھا جس کی کشادہ گیلری میں پردہ دار بڑے خوبصورت کبین بنے ہوئے تھے۔ میں قصد آس ہوٹل میں آیا تھا کیونکہ میں ثریا سے عشق کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جیب رخصت کر دی اور ثریا کو اوپر گیلری والے کبین میں لے آیا۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے پر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور ثریا مجھ سے کافی نگل گئی۔ کھانے کے بعد میں نے کافی منگوائی۔ یہاں کی کافی شہر بھر میں مشہور تھی۔ اس کافی کے ساتھ ناریل کے دودھ کی بجائے بھینس کا دودھ ملتا تھا۔ کیونکہ ناریل کے دودھ سے کافی کے فلیور کے بگڑ جانے کا خطرہ ہے۔ میں نے ثریا کے لیے بنائی وہ آہستہ آہستہ کافی پینے لگی۔ اور میں نے ہلکے جلا کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ ثریا نے اپنے کپڑوں پر خس کا عطر مل رکھا تھا۔ کبین والے تیز پٹیکے کی ہوا میں خس کی خوشبو اڑتی جا رہی تھی۔ اور مجھے ثریا پر ایک ایسے جزیرے کا گمان ہو رہا تھا۔ جو ابھی دریافت نہ ہوا ہو۔ جو دور دراز کے گمنام سمندروں میں چھپا اپنے ساحل پر اترنے والوں کا انتظار کر رہا ہو۔ دوسرا احساس مجھے سوندھی سوندھی خوشبو اڑتی مٹی کا ہوا، مٹی۔۔۔۔۔ جس

ثریا نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ثریا کا مسکراتا ہوا چہرہ میرے سامنے تھا۔

اس کے ساتھ ہی اپنی حادث سے مجبور ہو کر میں نے ثریا کا ہاتھ تمام لیا۔ ثریا نے آہستہ سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ میں نے کھینچنا سا ہو کر کہا۔

"جی ہاں۔"

ثریا نے ہنس کر کہا۔

"یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"محبت میں انسان سالوں کی مسافت دنوں بلکہ منٹوں میں طے کر جاتا ہے ثریا۔"

ثریا نے بڑی بڑی شربتیں آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"تو گویا آپ کو محبت ہو گئی ہے؟"

میں نے جھٹ کہا۔

"محببت تو مجھے اسی وقت ہو گئی تھی جب میں نے زیب کے گھر تمہیں پہلی بار دیکھا

سیرادل تو اسی وقت دھڑکنے لگا تھا۔ جب پہلی بار تمہاری آواز میرے کانوں میں پڑی

رتم نے مجھے یکارا تھا۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے میں مدت سے تمہیں جانتا ہوں۔"

ثریا میری طرف دیکھ کر برہمی و شرارت سے مسکرائے جا رہی تھی۔ اس کی ٹھوڑی کا

تل کا لے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کھلتا ممسوس ہو رہا تھا۔ رخساروں پر کچھ حیا کی شوخی

لگی تھی۔ وہ ہونٹ سکڑ کر کافی بھی پئے جا رہی تھی۔ اور میری گفتگو بھی سن رہی تھی۔

"آپ کے خیال میں محبت کیا ہے مسٹر وحی؟"

ثریا کے سوال نے مجھے ایک دم پریشان سا کر دیا۔ میں نے آج تک کئی لڑکیوں سے

مہبت کی تھی۔ مگر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ مہبت کیا ہوتی ہے۔ میرا ذہن الٹ پلٹ سا گیا۔

لیکن ثریا کو بروقت جواب دینا بھی ضروری تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میں نے سگریٹ بجاتے

ہو لے کہا۔

"محبّت دو دلوں کے ملاپ کا نام ہے۔ محبت پھول کی خوشبو ہے۔ چاند کی چاندنی ہے۔ اور

جنگلوں کی صبح ہے۔ محبت زندگی ہے اور زندگی محبت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

ثریا نے میری بات کاٹ دی۔

"یہ تو آپ سستے ناولوں کے ہیروؤں ایسی باتیں کرنے لگے۔"

حقیقت یہ ہے کہ میں ضرر سار ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی کے سامنے ضرر مند

ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ سستے ناولوں کی باتیں تھیں۔ اور میں نے محبت کی

اس قسم کی تعریف کو کسی گھٹیا ناول میں ہی پڑھاتا۔ اب کیا کیا جائے۔ لڑکیوں کے سامنے

مہبت کی کچھ ایسی ہی تعریف کی جاتی ہے۔ کیونکہ لڑکیاں اس قسم کی مہمل اور لایعنی باتوں

سے خوش ہوتی ہیں۔ لیکن معلوم ہو رہا تھا کہ ثریا اس قسم کی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے پھر کہا۔

"مہبت کی صحیح تعریف آپ کے نزدیک کیا ہے۔ یعنی آپ دلی طور پر اس جذبے

کو کیسے ذہن میں لاتے ہیں اور کیونکر اسے سمجھتے ہیں۔"

میں نے سوچا یہاں بے معنی باتوں سے دال نہیں گلے کی۔ یہ لڑکی حقیقت پسند معلوم

ہوتی ہے۔ اس سے حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیئے۔ میں نے نیا سکرٹنگ سسٹم لگا کر کہا۔

”کیا تم مجھے یقین دلا سکتی ہو کہ محبت کی صحیح تعریف سن کر تم یہاں سے اٹھ کر چلی

نہیں جاؤ گی؟"

"بالکل یقین دلاتی ہوں۔"

ثریا نے مسکرا کر کہا۔ وہ برابر مسکرائے جا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں ضرارت

اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تمام لیا۔

"تو سنو! میرے خیال میں محبت جوان عورت اور جوان مرد کے صحت مند جسموں کی

کُش کا نام ہے۔ یہ ایک نامحرم عورت اور ایک نامحرم مرد کے درمیان سمجھوتہ ہے کہ ہم کچھ

ثریا نے گھبرا کر ہاتھ پیچھے پھینچ لیا۔ اس کے رخساروں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی اور اس نے نظریں جھکا لیں۔ میں نے اس خاموشی کو نسیم رضامندی پر محمول کرتے ہوئے مزید جرات سے کام لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں ثریا کا خوبصورت گول چہرہ تمام لیا۔

ثریا نے جلدی سے کہا۔

"میں تو اسے ہر روز ایک خط لکھتی ہوں اور وہ بھی مجھے خط لکھتا رہتا ہے۔ میں اگلے ماہ یہاں سے گھر واپس جاؤں گی تو وہ سٹیشن پر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ ہمیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ پیار ہے اور اتنا پیار کہ ہمیں خود بھی اس کا اندازہ نہیں۔"

میں نے سر جھٹک کر کہا۔

"ثریا! یہ جان کر بھی کہ تم کسی لڑکے سے پیار کرتی ہو میں بدستور تم سے محبت کرتا ہوں اور محبت کرتا رہوں گا۔ اس لیے کہ محبت میں محبت کرنے والے کے رشتہ داروں سے بھی پیار ہو جاتا ہے۔ مجھے تو اس لڑکے سے بھی محبت ہو گئی ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ سکھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کہی گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ چیز چھین لوں جسے تم پیار کرتی ہو۔ اور جسے تم اپنا دل دے چکی ہو۔ مجھے تم اپنا دل بھی نہ دو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ میرے نزدیک کوئی بھی انسان کسی دوسرے کو اپنا دل دے کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ مجھے دنیا کی کسی دوسری چیز سے سروکار نہیں۔ میں تم سے سدا پیار کرتا رہوں گا۔"

ثریا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کو میری من گھڑت بے معنی باتوں نے بڑا متاثر کیا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ میں نے رومال سے اس کے آنسو پونچھے۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ میرا نشانہ ٹھیک رہا تھا۔ درخت کی سب سے اونچی شاخ پر لگی ہوئی انجیر ٹوٹ کر میری جھولی میں آن گری تھی۔ میں نے ثریا کا آنسوؤں بھرا چہرا ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور اس کے کانپتے ہوئے شہد آگئیں ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ واقعی گوجرانوالہ کے خربوزے بے حد شیریں تھے۔ ان ہونٹوں میں ان جنگلی پھولوں کی خوشبو اور مٹھاس تھی جو پہاڑیوں کی اوٹ میں اُگتے ہیں اور جن کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ ثریا نے صرف اس لیے اپنا آپ میرے حوالے کر دیا تھا کہ میں اس کے محبوب سے محبت کرتا تھا۔ شاید وہ مجھے بھی اپنا محبوب سمجھنے لگی تھی۔ عورتیں انتہائی مکار ہونے کے باوجود انتہائی معصوم اور نہتی ہوتی ہیں۔ آدمی ذرا ہوشیار ہو تو وہ پہلے ہی وار میں چاروں شانے چت زمین پر گر پڑتی ہیں۔ میں ثریا سے لپٹا اس کا منہ جو متا رہا۔ اس کے ہونٹوں سے بڑی گہری اور میٹھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس کا بار اجمت مند بھرا بھرا کسا کسا یا کانپتا ہوا گرم گرم بدن خس کی

جاتے ہیں۔

ثریا نے کہا۔

"لیکن میں ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جس نے محبت کی شادی کی تھی۔ اس کی شادی کو دس سال ہو گئے دو نوں میاں بیوی بڑے خوش و خرم رہتے ہیں۔ ان کی آپس میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا۔

"پھر انہوں نے یقیناً شادی کے بعد محبت کرنی شروع کی ہوگی۔ شادی کے بعد اگر محبت ہو جائے تو وہ موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ مگر شادی سے پہلے کی محبت شادی کے بعد زندہ نہیں رہ سکتی۔ شادی شدہ اور ٹیڈ محبت کی توہین ہے اور کوئی بھی صبح انسان اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ محبت ایک آزاد اور خود مختار جذبہ ہے۔ اسے کسی بندھن میں بند کر دو سلاخیں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ میں بھی اسی سچے اور آزاد جذبے کے ساتھ تم سے محبت کرتا ہوں ثریا۔"

ثریا نے خاموش اور گہری قسم کی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"لیکن میں ایک لڑکے کو اپنا دل دے چکی ہوں۔"

کیہن میں خاموشی طاری ہو گئی۔ اب وہاں سوائے پنکھے کی آواز کے اور نیچے سے آنے والی لوگوں کی ہلکی ہلکی آوازوں کے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ثریا نے گویا ایک ایسا بم چلا دیا تھا جس نے وقتی طور پر ایک زبردست دھماکہ پیدا کرنے کے بعد فضا میں گہرا سناٹا طاری کر دیا تھا۔ تو کیا یہ لڑکی کسی دوسرے سے محبت کر رہی ہے۔ بڑی بری بات ہو گئی۔ میں نے بظاہر بڑی اداس آواز میں پوچھا۔

"کون ہے وہ؟"

ثریا نے سر جھٹکا کر کہا۔

"گوجرانوالہ میں رہتا ہے۔ شاید ہماری منگنی بھی ہو جائے۔ وہ ہمارا رشتہ دار ہے۔ گھر

والے وہاں میرا بیاہ کرنے پر راضی ہو گئے ہیں۔"

میں نے سگڈٹ ایش ٹرے میں مسل کر کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اس لڑکے سے محبت کرتی ہو ثریا؟"

آکر داد پیش دیتے تھے۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ جسم ٹوٹ رہا تھا اور رگ رگ میں ایک پر گرم ٹھنکن سی سرایت کر گئی تھی۔ ثریا میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے صحت مند بھرے بھرے گداز اور سفت جسم کی گرمی سے میرا سانس جل رہا تھا۔ جھونپڑیاں درختوں کے جھنڈوں میں ویران پڑی تھیں۔ وہاں کوئی متنفس نہ تھا۔ کیونکہ گرمی اور حبس بے حد ہو رہا تھا۔ ثریا پسینے میں خرا بورتی تھی اور بار بار رومال سے منہ پونچھ رہی تھی۔ اس کی ہنل میں بھی پسینے نے قمیض کو گیلیا کر دیا تھا۔ چلتے چلتے ہم ساحل سمندر پر ناریل کے درختوں میں کافی دور ٹھل گئے۔ ہمارے عقب میں چٹانیں آگئیں جن کے پتھروں سے سمندر کی موجیں ٹکرا کر شور پیدا کر رہی تھیں۔ یہاں ہوا چلنے لگی اور ہماری جان میں جان آئی۔ میں نے ثریا کا بازو حام کر

ثریا کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور اس کا سانس ابھی تک درست نہ ہوا تھا۔ اس نے میری طرف عجیب پراسرار نگاہوں سے دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ میں اسے لے کر ناریل کے درختوں کے بیچ میں کھڑی ایک بانس کی ویران جھونپڑی کے دروازے پر آ گیا۔ ہم دونوں اس جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔

ٹریا کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری نظریں اٹھتے ہی اس نے آنکھیں جوکھلیں اور ذرا سا مسکرا کر بولی۔
 "یہ تو بڑی چپ چاپ جگہ ہے۔"

میں نے ثریا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھ لیا۔
 "آج سے یہ دل تمہارے قدموں پر ہے ثریا۔ تم اسے ٹھکرا دو۔ یا اٹھا کر اپنے سینے میں رکھ لو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"سیری محبت ان ساری باتوں سے بلند ہے ثریا! میں تمہیں اپنے محبوب کے ساتھ خوش دیکھ کر بے حد خوش ہوں گا۔ بلکہ میں تمہاری شادی میں شریک ہونے یہاں سے تمہارے شہر جانے کو تیار ہوں۔ خدا کرے کہ تم دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرو۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی۔ کہ میں تم دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھوں۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں بھی تمہاری پوجا کرتا ہوں۔ اور میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ دل کے تنہا مندر میں اکیلا بیٹھا تمہاری پوجا کرتا رہوں گا۔"

ثریا منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ بس وہ مجھ سے لپٹتی جا رہی تھی۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ جسم گرم ہو گیا تھا۔ کان سرخ ہو گئے تھے۔ اور ہونٹوں پر خشک ہوا چلنے لگی تھی۔ مجھے سیر مھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ہم جلدی سے الگ ہو گئے۔ میرا بل لے کر اند آ گیا۔ میں نے بل ادا کر دیا۔ میں نے ثریا سے پوچھا۔

"ثریا آنس کریم منگواؤں؟"

ثریا کا دم پھولا ہوا تھا۔ اس نے سر ہلا کر نہیں کہا۔ بیرا چلا گیا۔ تصویر می دیر بعد ہم بھی فرسکو ہوٹل کے کیبن سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی۔ اور بادلوں کا آسمان پر نام و نشان تک نہیں تھا۔ گھر سے نیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور گرمی کے مارے لوگوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ کیونکہ ہوا بدستور بند تھی۔ ابھی دو ہی بجے تھے۔ میں ثریا کو لے کر سمندر کے کنارے لیونیا کلب کے عقبی ناریل کے ذخیروں میں آ گیا۔ یہاں ناریلوں کے گھنے جھنڈ تھے۔ ایک طرف سمندر کی موجیں ساحل کے پتھروں سے ٹکرا رہی تھیں اور دوسری طرف ناریلوں کا جھنگل حد نگاہ تک چلا گیا تھا۔ یہ جھنگل گال روڈ کے ساتھ کولمبو کے جزیرے کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ یہاں کہیں کہیں بانس کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ جھونپڑیاں ان لوگوں نے بنوا رکھی تھیں۔ جو چاندنی راتوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں

ثریا تیز تیز سانس لینے لگی۔ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"خدا کے لیے ایسا نہ کہیں میں کسی کا دل نہیں ٹھکرا سکتی۔"
"سیری ثریا۔"

میں نے ثریا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ میرے ہونٹ ثریا کے ہونٹوں پر تھے اور باہر سمندر کی لہروں کا شور اٹھ رہا تھا۔ ہوا ناریل کے درختوں میں سے سرسراتی گذر رہی تھی۔ جھونپڑی کا دروازہ نصف بند تھا۔ پچھلی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا۔ زمین پر ناریل کی چھال بچھی ہوئی تھی۔ ناریل کا جنگل ویران اور سنسان تھا۔ گرم دوپہر میں وہاں جانور بھی کوئی نہیں بول رہا تھا۔ میں نے ثریا کو ناریل کی چھال پر بٹھالایا۔ وہ نیم دلی سے میرے ہاتھ کو اپنی قمیض میں سے باہر نکالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں نہیں وحی ایسا نہ کریں۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ ضرور محبت کرتی ہوں۔ مگر محبت کا مطلب یہ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ خدا کے لیے محبت یہ نہیں ہوتی۔۔۔۔۔"

لیکن محبت اس کے بغیر اور کیا ہوتی ہے پھر؟ اگر محبت میں سے عورت کا خوبصورت سینہ، سڈول کو لے، رس بھرے ہونٹ اور بھرے بھرے بازو نکال دیں تو اس میں باقی کیا رہ جائے گا۔ کیا ہم کسی ایسی عورت سے محبت کر سکتے ہیں جو ہڈیوں کا ڈھچھو ہوا اور جس کے زخموں پر کھیاں، بھینجا رہی ہوں۔ ہم اس سے ہمدردی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہسپتال سے دوائی لاتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔ لیکن اس کا منہ نہیں چوم سکتے۔ اس سے بنگلیگر نہیں ہو سکتے۔ اس سے محبت نہیں کر سکتے۔ محبت ایک خالص جنسی جذبہ ہے۔ جو غیر خوبصورت سہی مگر صحت مند جوان عورت کا طلبگار ہے۔ محبت میں جسم ہی سب کچھ ہے۔ اگر جسم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ہم اس کے بغیر روح کا تصور بھی قائم نہیں کر سکتے۔ یہی ہم سے محبت میں ٹھنڈی آہیں بھرواتا ہے۔ یہی ہم سے پہاڑ کاٹ کر ندی نکھواتا ہے۔ یہی لیلیٰ کے کتوں کو پیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی ہمیں درد انگیز یادوں کے خزانے دیتا ہے اور یہی ہمیں اسخِ حقیقی کے اس دروازے میں داخل کرواتا ہے جس کے اندر یہ خود قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ میں نے ثریا کو اپنے ساتھ لگا رہا تھا اور اس کے جسم

کے نشیب و فراز میں سے ہوتا ہوا حسنِ حقیقی کی جستجو میں سرگرداں تھا۔ ثریا بے سدھ ہو کر پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ کھلے تھے اور سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ میں نے اس کا سینہ چوم کر کہا۔

"ثریا! تم ناریل کے جنگل کی وہ گرم ہوا ہو جو عین دوپہر کو سمندر سے ہو کر چلا کرتی ہے۔ اس ہوا میں ناریل کے تنوں کی گرم بُورچی ہوئی ہے۔ تم سمندر کی موج کا وہ پانی ہو جو ساحل پر آکر زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور پھر کبھی لوٹ کر سمندر کی طرف نہیں جاتا۔ تم ناریل میں چھپا ہوا سفید بے داغ ان چھوا پھول ہو۔ تمہاری خوشبو آج تک کسی نے محسوس نہیں کی۔ تمہارے نازک لبوں کی حلاوت سے کسی کے ہونٹ آشنا نہیں ہوئے۔ تمہارے جسم کی گرمی میں گرم سمندروں کی مرطوب خوشبو ہے۔ تم واقعی ناریل کی دیوی ہو۔ ناریل کے گھنے جنگل کی دیوی ہو۔ جو گرم دوپہروں کو کھردری چھال کا لباس پہنے نیم عریاں حالت میں گھنے جھنڈوں میں سے جھانک کر دکھائی کرتی ہے۔"

ثریا خاموش تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ نیم وا تھے۔ اور وہ ناریل کی چھال پر جھونپڑی کے نیم اندھیرے میں بے سدھ پڑی تھی۔ پھر سمندر کی طرف آنے والی موجوں کا شور زیادہ بھیاںک ہو گیا۔ ناریل کے درختوں میں چلنے والی دھیمی ہوا کے جھونکے شوریہ سر ہو کر چپخنے چلانے لگے۔ سورج زیادہ گرم ہو گیا۔ دھوپ زیادہ جلنے لگی۔ ساری جھونپڑی پسینے میں شرابور ہو گئی۔ اور پھر چاروں طرف مندروں کی گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔۔۔۔۔ جس وقت ہم سمندر کے ساتھ ساتھ واپس آ رہے تھے۔ آسمان پر بادلوں کے قافلے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ثریا کا سر جھکا ہوا تھا۔ کدب کی قمیض جگہ جگہ سے مسلی ہوئی تھی۔ اور وہ گھری سوچ میں ڈوبی چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ میں نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تمام کر چوم لیا۔ ثریا نے ذرا سا مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ہوا تیز ہو گئی۔ اور ہلکی ہلکی بوند بوندی شروع ہو گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تمام لیا اور لیونیا کلب کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

بارش تیز ہو گئی۔ جس وقت ہم ہنستے مسکراتے قہقہے لگاتے لیونیا کلب کے برآمدے میں پہنچے ہم بارش میں بھیگ چکے تھے۔ ثریا کے بال ماتھے پر چپک گئے تھے اور ریشمی قمیض گیلی ہو کر اس کے جسم سے چمٹ گئی تھی۔

اس رات مسز جونس نے واقعی اپنے خاوند اور بچوں کو گھر سے باہر بھیج دیا تھا۔
میں اولس پیلس میں شام کو آیا تو وہ لان میں کوٹھی کی دیوار کے پاس کھڑی ملازمہ سے
پھولوں کا گلدستہ بنوا رہی تھی۔ آج اس نے نہادھو کر اُبلے کپڑے پہن رکھے تھے اور بالوں کا
جوڑا بڑا کس کر بندھا ہوا تھا۔ جس میں چبے کی کلیاں سج رہی تھیں۔ اس کی سج دھج زالی تھی۔
وہ کوئی تیس سال کی جوان عورت معلوم ہو رہی تھی۔ ہونٹوں پر اس نے خلاف معمول تھوڑی
تھوڑی سرخی جھرا رکھی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میرے قتل کا سارا سامان ہو چکا ہے۔ مجھے کوٹھی
میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ مسکرا کر بولی۔

"مسٹر وھی! میں پھولوں کا گلدستہ بنا رہی ہوں۔ تمہیں پھول پسند ہیں کیا؟"

میں نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ضرور پسند ہیں میڈم!"

مجھے اس زبردست قسم مردار عورت سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن آج میں بچ کر
کھیں نہیں جاسکتا تھا۔ میری حالت اس بکرے کی سی تھی جسے رات کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ میں
نے کمرے میں جا کر غسل کیا۔ قمیض پاجامہ پہنا اور برآمدے میں بیٹھ کر شام کا اخبار پڑھنے
لگا۔ مسز جونس بال کمرے میں ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھی اور خادمہ کے ساتھ مل کر خوابگاہ کی
صفائی کروا رہی تھی۔ میں نے جھانک کر بال کمرے میں دیکھا۔ کھانے والی میز کے عین بیچ
میں پھولوں سے بھرا ہوا گلدان رکھا تھا۔ اور الماریوں کے شیشے چمک رہے تھے۔ شام آہستہ
آہستہ گھری ہو رہی تھی۔ اور آسمان پر بادل پوری طرح چھا گئے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل
رہی تھی۔ میں تریا کے ساتھ ساحل سمندر پر ناریل کے جنگل میں گزاری ہوئی گرم دوپہر کے
خیال میں لگن تھا کہ مسز جونس میرے قریب آکر بولیں۔ میں نے ان لوگوں کو آنٹی کے
ہاں سمجھادیا ہے۔ وہ کئی روز سے بیمار تھی۔ میں نے جونس سے کہا تم اس کی خبر لینے کیوں
نہیں جاتے۔ ہر کام کے لیے میں ہی رہ گئی ہوں۔ بچوں کو لے کر وہاں جاؤ اور رات وہیں
گزارو۔ آخر وہ کیا کہنے کی۔"

پھر وہ ہنس پڑی اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولی۔
"دیکھا میں نے اس مردود کو کیسا چلتا کیا۔ ارے وہ تو میری جان کا دشمن ہو گیا ہے۔
جب دیکھو سر پر موجود رہتا ہے۔"

میں نے اخبار پر نظریں گاڑے ہوئے کہا۔

"اور اگر وہ بال بچوں سمیت رات کو آگیا تو؟"

مسز جونس قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ اس کے قہقے نے میرے سارے جسم کو اس کی
طرف متوجہ کر دیا۔

"آنٹی یہاں سے ستر میل کے فاصلے پر رہتی ہے۔ اور وہاں شام کے بعد کوئی ریل
گاڑی اور بس کو لمبو نہیں آتی۔"

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم دونوں برآمدے میں بیٹھے بیس رہے تھے۔

مسز جونس کا خیال تھا کہ شراب اسے نقصان دیتی ہے۔ اس لیے بیس رہی جانی
چاہیے۔ لیکن میں بیس میں سکاچ ملا کر پی رہا تھا۔ کیونکہ اس مرطوب موسم میں بیس رہی بی کر میرا
پیٹ خراب ہو گیا تھا۔ ہمیں وہاں بیٹھے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ کانا عاشق اپنی بطن نما محبوبہ
کے ساتھ آگیا۔ مسز جونس کے چہرے پر میں نے اس شخص کی آمد پر پہلی بار نفرت کے
آثار دیکھے۔ لیکن اس وقت وہ ان دونوں کا خیر مقدم کرنے پر مجبور تھی۔ کانے عاشق نے
آتے ہی مسٹر جونس کا پوچھا جب اسے معلوم ہو کہ وہ آنٹی کی خبر لینے بچوں کے ساتھ گیا
ہے تو اس نے اپنی اکلوتی آنکھ سے بڑے مشتہ انداز میں میری طرف دیکھا اور جیب سے
دیسی شراب کی آدھی بوتل نکال کر میز پر رکھ دی۔

"میں اپنا راشن لے آیا ہوں۔"

مسز جونس نے نفرت سے ناک سکڑ کر کہا۔

"ظاہر ہے تم اپنا راشن لے کر ہی چلتے ہو۔"

پھر وہ بطن نما محبوبہ سے باتیں کرنے لگ گئی۔ کانا عاشق دیسی شراب کی بوتل کھولنے
لگا۔ بوتل کھول کر اس نے اپنی محبوبہ سے پوچھا۔ بطن نے پینے سے معزوری ظاہر کی۔ مسز
جونس نے کہا۔

"تم اسے دیسی ٹھرا پلا پلا کر مارنا چاہتے ہو کیا؟ تمہارا داغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ میں

اسے بیسر پلاؤں گی۔"
 "نو ٹھیکس آنٹی۔"
 "کوئی بات نہیں۔"

اور مسز جونس نے ایک گلاس میں بیسر ڈال کر کانے عاشق کی محبوبہ کے سامنے رکھ دیا۔ کاناعاشق مسکرایا۔ اور مزید بد صورت ہو گیا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے شراب کا پہلا جام حلق کے اندر ڈال لیا۔ اس کی محبوبہ آہستہ آہستہ بیسر پینے لگی۔ کوئی گھنٹہ بعد سب کو نشہ چڑھ گیا تھا۔ بطح محبوبہ نے لالچ میں آکر تین گلاس بیسر پی لی تھی اور اب اس کا سر گردن پر نہیں ٹھہر رہا تھا۔ کاناعاشق نصف بوتل ختم کر چکا تھا اور طوطے کی طرح گردن مار رہا تھا۔ اس نے کئی بار اپنی محبوبہ کے بوسے لئے۔ بطح بار بار منہ اٹھاتی۔ کاناعاشق بطح سے ایک بوسہ جڑ دیتا۔ دونوں مسکراتے اور پھر شراب پینا شروع کر دیتے۔ مسز جونس کو ان دونوں پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ وہ انہیں کھانے سے پہلے ہی چلتا کر دنا چاہتی تھی۔ مگر اسے بہانہ نہیں مل رہا تھا۔ آخر وہ اٹھ کر بولی۔

"اچھا بھئی میں سونے چلی۔"

کانے عاشق نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"کیا آج کھانا نہیں کھاؤ گی؟"

مسز جونس نے غصے سے کہا۔ "نہیں۔"

اور اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اٹھے۔ مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے کو سہارا دیئے ایک دوسرے کر کندھوں پر سر رکھے کوٹھی کے دروازے سے باہر نکل گئے۔ مسز جونس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر ان دونوں کو سرک پر جاتے دیکھا اور بولی۔ "یہ لوگ ہمیشہ میرا پروگرام خراب کرتے ہیں۔"

پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور میرے گلاس میں سکاچ ڈال کر میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں نے آج بطح پکائی ہے۔ خود پکائی ہے۔ تم کھاؤ گے تو حیران رہ جاؤ گے۔"

اتنے میں بادل زور سے گر جا اور مینہ شروع ہو گیا۔ ہم اپنا اپنا گلاس اور بوتلیں اٹھا کر صاگ کر برآمدے میں آ گئے۔ مسز جونس نے آستین سے آنکھیں پونچھ کر کہا۔

"اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

اب ہم ہال کمرے میں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اور شراب و بیسر کا دور شروع ہو گیا۔ کھانا میز پر لگا دیا گیا۔ اور خادمہ باورچی خانے والے دروازے میں سٹول پر بیٹھی سگار پی رہی تھی۔ کچھ درنیک یہاں بیٹھ کر بادہ کشی ہوتی رہی۔ مسز جونس آج دلکش نظر آرہی تھی۔ ایک تو اس نے ہونٹوں پر لپ سٹک جمار کھی تھی۔ دوسرے غالباً وہ ایک سال بعد آج نہائی تھی۔ کپڑوں سے ایوننگ ان پیرس کی خوشبو آرہی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا اندر جا کر اس نے اوپر پوری شیشی کی شیشی انڈیل لی ہے۔ میں کافی پی گیا تھا اور نئے میں مست ہو کر بیٹھا سگریٹ سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ مسز جونس کو بھی خوب نشہ چڑھ گیا تھا۔ اس کا سر جھوم رہا تھا۔ وہ بار بار نوکرانی کو بلاتی اور کوئی نہ کوئی کام سوچ دیتی۔ وہ بات بات پر قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کا ہر قہقہہ میرے سامنے اس کی جوانی کو لاکھڑا کر رہا تھا۔ ہر قہقہے کے ساتھ مجھے اس کی عمر کم سے کم تر معلوم ہونے لگتی۔ یہ بڑی درد انگیز بات تھی۔ کیونکہ اس طرح غریب بکرا اپنے آپ بھری کی طرف کھینچ رہا تھا۔

اب ہم کھانے کی سیز پر بیٹھے تھے۔ مسز جونس نے بطح مارا بہترین گوشت مجھے کھلا دیا۔ کھانے کے دوران خوب لطیف بازی ہوتی۔ بعد میں کافی نے وہ سکی کا نشہ کم کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پانسی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے نوکرانی کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر مسز جونس سے اجازت لی اور اپنے کمرے میں آکر اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اور بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے بتی گل کر دی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد دروازہ دھڑ دھڑایا۔ میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سمجھ گیا۔ بلا نازل ہو گئی ہے۔ اب سوائے دروازہ کھولنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا۔ مسز جونس جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔ وہ مجھ سے لیٹ کر بولی۔

"تمہیں اپنا وعدہ یاد نہیں؟ دیکھو تو باہر موسم کتنا خوشگوار ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔

ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ کیوں نہ باہر برآمدے میں بیٹھا جائے۔"

میں نے لاکھ بہانہ کیا کہ نیند آرہی ہے۔ سر پھٹا جا رہا ہے۔ مگر مسز جونس کے سامنے ایک نہ چل سکی۔ وہ مجھے کھینچ کھینچ کر باہر نکال لائی۔ برآمدے میں بیٹھ کر موسم سے لطف اندوز ہونے کا تو ایک بہانہ ہی تھا۔ وہ مجھے لے کر سیدھی ہال کمرے میں آ گئی۔ نوکرانی سو

چکی تھی۔ ہال کمرے کی تمام بتیاں گل کر دی گئی تھیں۔ صرف کونے والی سرخ بتی روشن تھی۔ جس کی لال لال نیم روشنی میں مسز جونز کا چہرہ ایک چڑیل سے ملتا جلتا معلوم ہو رہا تھا۔ جو انسانی خون کی پیاسی ہو اور انسان کی تلاش میں سارے شہر کا چکر کاٹ کر آتی ہو۔

یہاں بیٹھ کر اس عورت نے مزید شراب پی اور مجھے بھی پلائی۔ اب ہم دونوں ہی شراب میں دھت ہو گئے۔ وہ مجھے دھکیلتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ یہ اس کی خواب گاہ اور میرا مقتل تھا۔ وہ خوشی سے ناچ رہی تھی اور میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ میرے گھٹنے ایک دوسرے سے بچ رہے تھے۔ پھری میری گردن کے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ مسز جونز نے سارے کپڑے اتار دیئے۔ اور مادر زاد برہنہ ہو کر کمرے میں ڈانس کرنے لگی۔ اس وقت مجھے وہ ایک اونٹ لگی جو پاگل ہو گیا ہو۔ میرا دل متلانے لگا۔ مگر مجبور تھا۔ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دھکا دے کر مجھے پلنگ پر گرا دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔۔۔!

صبح اٹھ کر دیکھا کہ اپنے بستر پر پڑا ہوں اور سارا جسم یوں درد کر رہا ہے جیسے رات بھر کسی تھانے میں میری ٹھکانی ہوتی رہی ہو۔ میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ گالوں پر اور گردن پر دانٹوں کے کاٹے کے نشان تھے۔ جگہ جگہ سرخی کے دھبے پھیلے ہوئے تھے۔ مسز جونز نے میرے لئے پانی گرم کر رکھا تھا۔ اس نے مجھے خود گرم پانی سے نہلایا۔ میرے زخموں پر ٹکڑ کی۔ بار بار معافی مانگی کہ رات اس سے زیادتی ہو گئی۔ میں بدن پر ہاتھ لگا لگا کر دیکھا رہا تھا کہ اور کس جگہ درد ہو رہا ہے۔ دفتر میں سارا دن اسپر وکھاتا اور سارا دن اٹھتے بیٹھتے ہانے والے کرتا رہا۔ دوسرے روز جا کر کہیں میرے ہوش ٹھکانے ہوئے۔ اب میں پوری طرح سمجھ گیا تھا کہ عورت کہاں سے شروع ہوتی ہے اور خود کہاں جا کر ختم ہوتی ہے اور مرد کو کہاں جا کر ختم کرتی ہے۔ میں مسز جونز کے سائے سے بھی بھاگنے لگا تھا۔ میں نے فوراً شہر میں کسی دوسری جگہ کی تلاش شروع کر دی۔ اتوار کو میں اولس پبلز سے گال روڈ پر ایک فلیٹ میں شفٹ کر گیا۔ یہ فلیٹ تین کمروں پر مشتمل تھا اور دو سو روپے اس کا کرایہ تھا۔ کرایہ اگرچہ زیادہ تھا۔ مگر مسز جونز کے بچنے سے ٹکنے کے لئے میں چار سو روپے ماہوار پر بھی جگہ لینے کو تیار تھا۔ جب میں ٹرک میں سامان لا کر جانے لگا تو مسز جونز مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

"اسختم کیوں جا رہے ہو؟ تمہیں یہاں کیا تکلیف تھی؟ ہم نے تمہیں کبھی ناراض نہیں ہونے دیا؟ اب کہاں جا کر رہو گے؟ کیا ملنے آیا کرو گے؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں نہیں! میں تو روز شام کو ملنے آیا کروں گا۔ دراصل مجھے دفتر کے پاس ہی جگہ مل گئی ہے۔ میں بلا شام کی محفل کو بھلا سکتا ہوں؟"

حالانکہ دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ بلا سر سے ٹلی۔ مجھے تو بوریل چوک کے نام ہی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ میں جلدی سے ٹرک میں بیٹھ گیا۔ ہاتھ لا کر سب سے رخصت ہوا اور ڈرائیور سے کہا۔

"جلدی یہاں سے نکل چلو۔"

پیر وار کو میں نے سارا دن ایلورا کے فون کا انتظار کیا۔ لیکن کوئی فون نہ آیا۔ میں نے سوچا شاید منگل وار کو وہ فون کرے۔ مگر منگل کا بھی سارا دن گزر گیا۔ اس کا کوئی فون نہ آیا۔ میں بے چین ہو گیا۔ کیونکہ ایلورا وعدے کی بڑی پابند تھی۔ کچھ مجھے بھی اس پر اسرار پھیلے جسم کی ساتھی سے محبت ہو گئی تھی۔ منگل کی شام کو میں ہسپتال روڈ پر اس کے مکان کے سامنے سے گزرا۔ سوچا شاید مکان پر قفل پڑا ہو اور وہ کولمبو سے باہر چلی گئی ہو۔ لیکن مکان میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازے پر کوئی تالا نہیں تھا۔ گویا ایلورا وہیں تھی۔ پھر وہ مجھ سے وعدہ کر کے ملنے کیوں نہیں آئی؟ بیمار تو نہیں ہو گئی؟ میں وہاں سے سیدھا چوک والے بدھی مندر میں گیا۔ وہاں گھنٹہ بھر بیٹھا رہا۔ لیکن ایلورا کی شکل کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ناکام ہو کر واپس فلیٹ پر آ گیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہر روز صبح سے شام تک میں ایلورا کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ ذرا گھنٹی بجتی اور میرا دل دھڑکنے لگ جاتا۔ شاید یہ ایلورا کا فون ہو۔ لیکن وہ شبہ گھڑمی نہیں آرہی تھی۔ ایلورا کہیں گم ہو گئی تھی۔ اسختم مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے گھر میں داخل ہونے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ میں نے ایک روز دفتر کی ایک فائل کاپی اور پنسل لی اور گاڑی میں بیٹھ کر سیدھا ہسپتال روڈ والے ایلورا کے مکان پر آ گیا۔ گاڑی گھڑمی کر کے میں نے دروازے پر دھڑکتے ہوئے دل سے دستک دی۔

شام کا وقت تھا۔ میرا خیال تھا کہ سبھی لوگ گھر پر موجود ہوں گے۔ دوسری بار دستک دینے پر ایک کالی سی نوعمر لڑکی نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا۔

"اپنے ڈیڈی کو بلاؤ۔"

لڑکی مسکرا کر اندر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک کالا سادہ بلا ہٹلا دھیر عمر کا آدمی نمودار ہوا۔ اس نے پاجامہ کرتے پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگا تھا۔ یہ ایلورا کا وکیل باپ تھا۔ میں نے مسکرا کر سلام کیا۔ اس نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ میں نے کہا۔

"معاف کیجیے گا آپ کو تکلیف دی۔ میں ریڈیو سیلون کا نمائندہ ہوں۔ ہم نے ابھی ابھی ایک نیا فیچر پروگرام شروع کیا ہے۔ جس میں ہم کولمبو شہر کے مختلف اور پرانے وکیلوں کی گھریلو زندگی کا جھلکیاں پیش کر رہے ہیں۔ آپ سے اسی پروگرام۔۔۔۔۔"

ایلورا کے باپ نے مسکرا کر کہا۔

"اندر تشریف لے آئیے۔ آئیے آئیے۔۔۔۔۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ دروازے کا پردہ اٹھا کر اندر کمرے میں لے گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں جلتی ہوئی بتی کی روشنی مجھے سامنے والے ہوٹل میں بیٹھ کر دکھائی دیا کرتی تھی۔ برآمدے میں وہ کرسی بھی بڑھی تھی جس پر اس روز ایلورا بیٹھ کر کتاب پڑھ رہی تھی اور کنکھیلوں سے مجھے بھی دیکھتی جاتی تھی۔ کمرہ بڑی سادگی سے سجایا گیا تھا۔ دیوار کے ساتھ آئینے سامنے دو پلنگ بچے تھے۔ دیوار میں مدراس کے درویش شاعر تیاگ راجہ کی بڑی تصویر لگی تھی۔ کارنس پر بدھ کے دو مجسمے پڑے تھے۔ نیچے میز پر گلدان رکھا تھا۔ جس میں پھول مرجھا رہے تھے۔ ایک عورت سفید دھوتی پہنے تخت پوش پر بیٹھی ترکاری بنا رہی تھی۔ ایلورا کے باپ نے کہا۔

"یہ میری بیوی ہے۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔ بڑا ہنس کھد وکیل تھا۔ ایلورا کی ماں نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور پھر ترکاری بنانے میں مصروف ہو گئی۔ وہ لڑکی جس نے دروازہ کھولا تھا۔ پلنگ پر پاؤں لٹا کر بیٹھ گئی اور شرارتی نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں نے جعلی فائل کھول کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر نوٹ بک اور پینسل کمال کر پوچھا۔

"آپ یہاں کب سے مقیم ہیں؟"

"کئی سالوں سے یہاں رہ رہا ہوں۔"

"کیا آپ کو یہ شہر پسند ہے؟ میرا مطلب ہے کیا آپ کو اپنا وطن یاد نہیں آتا؟"

ایلورا کا باپ ہنس پڑا اور عینک اتار کر اس کے شیشے کو پونچھتے ہوئے بولا۔

"ہمارا وطن تو وہیں ہے جہاں ہماری روزی ہے۔ جہاں ہمارے بال بچوں کا بیٹ بھرتا ہے۔ ویسے مدراس یاد ضرور آتا ہے۔ پھر وہ زیادہ دور بھی نہیں۔ سال میں ایک آدھ چکر ضرور لگا آتے ہیں۔"

میری نگاہیں ایلورا کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کیا وہ کسی رشتہ دار کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ یہ تو بڑی بری بات تھی۔ اس کے بعد اس گھر میں داخل ہونے کا اتنا اچھا موقع پھر کہاں آنے گا۔ ایلورا کو آج ضرور موجود ہونا چاہیے تھا۔ ایلورا کے باپ سے باتیں کئے جانا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"صرف ایک لڑکی ہے جی۔ یہ لڑکی جو آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔ گیارہ برس کی ہے۔ مگر بڑی شرارتی ہے۔ سارا دن کھیلتی رہتی ہے۔ سکول کا کام بالکل نہیں کرتی؟ کیوں پدمنی؟"

پدمنی جھینپ گئی۔ اس کی ماں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر بڑے اطمینان سے ترکاری کاٹنے لگی۔ میں نے سوچا شاید میں نے غلط سنا ہے۔ میں نے پھر پوچھا۔

"کیا آپ کی صرف ایک بی بی ہے؟"

"جی ہاں صرف ایک بی بی پدمنی ہے۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ تو کیا ایلورا یہاں نہیں رہتی؟ ایلورا اس شخص کی بیٹی نہیں ہے؟ لیکن میں نے تو اسے کئی بار اس گھر کے برآمدے میں کتاب پڑھتے، برآمدے میں گیلے کپڑے نیچوڑ نیچوڑ کر ڈالتے۔۔۔۔۔ اپنی طرف نگہ لگا کر دیکھتے دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے ایلورا ان کی رشتہ دار ہو اور کوئی دن گزارنے یہاں آئی ہو۔ مگر ایلورا نے خود کہا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے پاس مہل روڈ پر رہتی ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا گورکھ دھندا ہے؟ میں نے بڑے طریقے سے پوچھا۔

"کیا یہاں کولمبو میں آپ کے دوسرے رشتہ دار لوگ بھی رہتے ہیں؟"

وکیل نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"جی نہیں۔ یہاں ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں۔ ہمارے رشتہ دار مدراس میں ضرور رہتے

ہیں۔ وہ بھی ہمیں ملنے یہاں کبھی نہیں آئے۔ دراصل جی وکیل کی زندگی بڑی تنہائی کی زندگی ہوتی۔۔۔۔۔"

وکیل باتیں بنائے جا رہا تھا۔ نوکر چائے کا پیالہ میرے پاس میز پر رکھ گیا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ میری کنپٹیاں بچنے لگی تھیں۔ اب میں بے تاب تھا کہ ایلورا کا نام لے کر ان سے دریافت کروں کہ اس نام کی لڑکی یہاں کبھی نہیں آئی تھی کیا؟ میں نے سگریٹ جلا کر صاف صاف پوچھ لیا۔

"ایک بات بتائیے۔ کیا یہاں ایلورا نام کی کوئی لڑکی بھی رہتی تھی۔ بات دراصل یہ ہے جی کہ میرے ایک دوست نے کہا تھا کہ اس نام کی لڑکی وکالت کرتی ہے اور اسی علاقے میں رہا کرتی ہے۔"

وکیل نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔

"یہ نام تو زندگی میں پہلی بار سنا ہے جناب! ایلورا نام کی لڑکی تو یہاں اس پاس کوئی بھی نہیں۔ کیوں جی تمہیں معلوم ہے؟"

وکیل نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ ادھر عمر عورت نے بھی نفی میں سر ہلا کر کہا۔
میں نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا۔ اس نام کی لڑکی اس علاقے میں کمبیں بھی نہیں رہتی۔"

میں بت بنا تھا۔ اب میں سب کچھ بھول گیا تھا کہ کس غرض سے، کیا بہانہ بنا کر اس گھر میں داخل ہوا تھا۔ میرے سامنے صرف ایلورا کی تصویر تھی۔ جو دھندلے میں گم ہو رہی تھی۔ میں نے بڑی بے باکی سے ایلورا کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔

"وہ بالوں میں پھول لگاتی تھی۔ اس کی آنکھیں شربتی تھیں۔ گال پر ایک کال لال بھی تھا۔ کانوں میں سبز پتھر ہوتے تھے۔ نازک سی لڑکی تھی۔"

"جی نہیں۔۔۔۔۔ یہاں ایسی کوئی لڑکی نہیں رہتی تھی۔"

"لیکن میں نے خود اسے اس مکان کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھتے پڑھتے دیکھا ہے۔"

"آپ کو معاملہ ہوا ہے جناب۔"

"ایک روز وہ گیلی ساڑھی باہر لٹنی پر ڈال رہی تھی۔"

"آپ نے کسی دوسرے گھر میں اسے دیکھا ہوگا۔"

"ایک روز وہ بھاگ کر اس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔"

"اس کا نام ایلورا تھا۔ ایلورا۔۔۔۔۔ خوبصورت اور پراسرار آنکھوں والی ایلورا۔"

"جی نہیں۔ اس نام کی لڑکی یہاں کبھی نہیں آئی۔ بلکہ پورے محلے میں ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے۔"

میں نے چیخ کر کہا۔ "وہ آپ کی بیٹی ہے۔ اس نے خود مجھے کہا تھا کہ آپ اس کے باپ ہیں۔"

وکیل سہم سا گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "میری تو صرف ایک ہی بیٹی ہے۔ یہ پدمنی۔۔۔۔۔ اور کوئی اولاد نہیں۔"

میں ایک دم اٹھا اور باہر نکل آیا۔ وکیل اس کی بیوی اور بیٹی پدمنی حیران ہو کر مجھے ہی دیکھتے رہ گئے۔ میرا سر چکر رہا تھا۔ میں ایک فٹ پاتھ پر کھڑا رہا۔ چاروں طرف گردن گھما کر دیکھا کہ میں سہل روڈ پر ہی ہوں یا کسی دوسری جگہ آ گیا ہوں۔ وہی سہل روڈ تھی۔ چوک والا بدھی مندر سامنے نظر آ رہا تھا۔ سامنے وہی ہوٹل تھا جہاں بیٹھ کر میں ایلورا کو اپنے مکان کے برآمدے میں گھومتے پھرتے دیکھا کرتا تھا۔ بالکل اسی جگہ سے ایک روز میں ٹرام پر گزرا تھا اور میں نے پہلی بار ایلورا کو برآمدے کے جھگے سے لگ کر کھڑی دیکھا تھا۔ وہ ٹکٹھی باندھے مجھے ٹک رہی تھی اور نکستی ہی چلی گئی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی میں سے نکل کر مجھے آواز دی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ بوجھل قدم اٹھاتا۔ سرک کی دوسری طرف گیا۔ گاڑی میں سوار ہو کر سر پیچھے لگا دیا۔ اور غور سے ایلورا کے گھر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہی دروازہ وہی لکڑی کا جھگلا، وہی برآمدہ، وہی کمرہ، کمرے کا وہی پردہ، برآمدے میں پڑی ہوئی وہی کرسی، پھر ایلورا کہاں گم ہو گئی۔ کیا میں نے بیداری میں کوئی خواب دیکھا تھا؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے ہونٹوں پر ایلورا کے ہونٹوں کی شدت ابھی تک موجود ہے۔

میرے جسم سے ابھی تک ایلورا کے جسم کی خوشبو اٹھ رہی ہے۔ اس کے کانوں میں جھگلا ہوتا سبز پتھر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے چمک رہا ہے۔ میں واپس فلیٹ پر آ گیا۔ ساری رات میں نے جاگ کر گزار دی۔ صبح منہ اندھیرے اس ہوٹل کے باہر والے نارمل کے درختوں کے جھنڈ میں گیا۔ جہاں ایک منگل وار کو ایلورا میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ اور جہاں اس نے پہلی بار مجھ پر یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ پچھلے جنم میں میری بیوی رہ چکی ہے۔

ناریل کے وہ دونوں درخت اسی طرح کھڑے تھے۔ جس کے سائے میں اس روز ہم دونوں نے بیٹھ کر کافی پی تھی۔ میں نے درختوں کو ہاتھ سے چھوا۔ جیسے پوچھا۔ ایلورا کہاں چلی گئی پیارے درختو! کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟ اس کے جوڑے میں سفید کنول تھا۔ کانوں میں سبز پتھر تھے اور ماتھے پر سرخ تنک تھا۔۔۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

شام کو میں پھر ہسپتال روڈ پر گیا۔ گھنٹہ بھر چوک والے مندر میں پھر تا رہا۔ کبھی صحن والے ستون کی چھت کو دیکھتا جس کے ساتھ لگ کر ایلورا نے مجھ سے پہلی بات کی تھی۔ کبھی مندر کی چھت پر جا کر اس منڈیر کو کھینچنے لگتا جس کے اوپر درخت کی گنجان شاخوں کا سایہ تھا اور جہاں میں نے پہلی بار ایلورا کے سرخ ہونٹوں کے گلوں کو چھوا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے مندر میں داخل ہونے والی ہر عورت کو گھور رہا تھا۔ مگر ایلورا کا سایہ بھی کبھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایلورا کبھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کبھی یہ میرا وہم ہی نہ ہو۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ایک شخص کے ساتھ بیٹھ کر دن بھر باتیں کریں، کافی باتیں۔ اس سے بغلیں ہوں اور پھر یہ باور کر لیں کہ اس کا اس دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں۔ کیا میں مندر کی چھت والی شام کو بھول سکتا ہوں؟ کیا میں مینما کے کپن والی دوپہر بھول سکتا ہوں؟ کیا میں وہ لمحات بھلا سکتا ہوں جو ہم نے ایک دوسرے کی معیت میں سمندر کے کنارے ناریل کے جھنڈوں میں بسر کئے تھے؟ اگلے روز میں ٹاور برج والی مارکیٹ کی اس بلڈنگ میں گیا۔ جہاں ایک روز مینما سے واپسی پر میں نے ایلورا کو گاڑی میں چھوڑا تھا اور جس کی سیرٹھیاں وہ میرے سامنے چڑھ کر اوپر گئی تھی۔ یہاں اس کی کوئی سیٹی رہتی تھی۔ میں بلڈنگ کی سیرٹھیاں چڑھ گیا۔ اوپر جا کر معلوم ہوا کہ وہاں کوئی رہائشی مکان ہی نہیں ہے۔ وہاں ساری بلڈنگ میں اوپر سے نیچے تک مختلف فرموں کے دفتری ہی دفتر ہیں اور کوئی کنبہ رہائش پذیر نہیں ہے۔ میں پریشان سے پریشان تر ہو رہا تھا۔ آخر ایلورا کا معہ کیا تھا؟ وہ درحقیقت کوئی عورت تھی یا محض چھلاوا؟ اسے زمین کھا گئی یا آسمان اٹھا کر لے گیا؟ کیا وہ پھر کبھی مجھ سے نہیں ملے گی؟ کیا اب اگلے جنم میں درشن ہوں گے؟

دو مہینے میں نے بڑی اداسی اور پریشانی میں بسر کئے۔ ایلورا کا خیال ہر گھڑی مجھ پر چھایا رہتا۔ یوں لگتا جیسے وہ میرے سامنے کھڑی مجھے اپنی گھڑی پر اسرار آنکھوں سے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ اس کے ماتھے کا تنک انگارہ بن کر دکھ رہا ہے اور کانوں میں سبز پتھر جک

رہے ہیں۔ تیسرے مہینے میرے لئے وہاں رہنا زیادہ دشوار ہو گیا۔ کولمبو شہر کے بازار اور سمندر کا کنارہ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ ہر گلی، ہر بازار، ہر ہوٹل، ہر سینما اور ہر مارکیٹ کی ٹکڑ پر مجھے ایلورا کا مسکراتا ہوا سراپا چہرہ دکھائی دیتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور سامان باندھ کر واپس چلنے کو تیار ہو گیا۔ صبح کی گاڑی مجھے کولمبو سے رخصت ہونا تھا۔ پر اسرار ایلورا کے شہر سے رخصت ہونا تھا۔ وہ رات میں نے شہر کی آوارہ گردی کرتے گزار دی۔ پہلے سمندر کے کنارے والے ناریل کے درختوں میں جا کر ایلورا کو یاد کرتا رہا۔ اسے آوازیں دیتا رہا۔ پھر رات گئے ہسپتال روڈ والے مندر میں آ کر اس کی چھت پر بیٹھ گیا اور ایلورا کو یاد کر کے خون کے آنسو بہاتا رہا۔ مندر میں گھڑی خاموشی طاری تھی۔ بدھ کا مجسمہ اپنے استوان پر آنکھیں بند کئے مکمل سکوت کی حالت میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کو ایلورا کے راز کا علم ہے مگر وہ مجھے نہیں بتا رہا۔ وہاں سے اٹھ کر ہسپتال روڈ پر واپس ایلورا کے مکان کی طرف چل پڑا۔ ایلورا کے مکان کا دروازہ بند تھا۔ کمرے کی بتی گل ہو چکی تھی۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ وہ آرام کر سی دیوار کے ساتھ لگی تھی جہاں ایک روز میں نے ایلورا کو کتاب پڑھتے دیکھا تھا۔ میں نے بند دروازے کو ہاتھ سے چھوا اور میرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اچانک جیسے کسی نے آہستہ سے مجھے پکارا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ آواز ایلورا کی تھی۔ جھٹکے کے اوپر ایلورا کی پر اسرار شکل میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کی طرف کر دیئے۔ ایلورا کا عکس غائب ہو گیا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔

صبح پہلی گاڑی میں کولمبو سے رخصت ہونے کے لیے سٹیشن پر گیا۔ میں نے کسی کو اپنی روانگی کی خبر نہیں کی تھی۔ میں چپکے سے گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔ ٹھیک وقت پر انجن نے سیٹی بجائی۔ گاڑی نے مہندی بلائی اور گاڑی پلیٹ فارم پر کھینکے لگی۔ جب گاڑی شہر سے میلوں باہر نکل آئی اور کھینکے لگاؤں سے گزر رہی تھی تو میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ایلورا گنجان جھنگوں کے پر اسرار اندھیروں میں کھڑکی ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلارہی ہے۔ میں نے بلدی سے کھڑکی بند کر دی اور آنکھیں بند کر کے سر دیوار سے لگا دیا۔ مجھے وہ لوک گیت یاد آنے لگا جو ایلورا نے سمندر کے کنارے ناریل کی چھاؤں میں بیٹھ کر مجھے سنایا تھا۔

میرے ہرن کو شکاری لے گیا۔
 الوداع پیارے ہرن!
 اب عمر بھر درشن نہ ہوں گے۔

دہلیز عام
 پاکستانی ادبیات
 ڈاکٹر عام